آنکھوں میں دھنک

علیم الحق حقی

دیباچہ

ایک بات پوچھوں آپ سے؟ آپ اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں؟ آپ یقینا کہیں گے.......... جی ہاں' بہت زیادہ۔ یہ سچ ہے۔ "کون ایسا پاکستانی ہوگا" جسے پاکستان سے محبت نہیں ہوگی۔ شاید ہی کوئی بدنصیب ایسا ہوگا۔

مگر ایک بات اور سوچیں.......... دیانت داری سے جواب دیں۔ آپ پاکستان کو کتنا جانتے.......... کتنا سمجھتے ہیں؟ پاکستان کو جاننے اور سمجھنے کے لئے کتنے حوالے ہیں آپ کے پاس؟ گردوپیش کی بدصورتی' معاشی بدحالی' سیاسی عدم استحکام' ہر سطح پر پھیلا ہوا کرپشن' خود غرض' مفاد پرست اور بدعہد سیاست دان اور مسلسل آسمان کی طرف دوڑ لگاتی مہنگائی! یعنی اچھے حوالے کم ہی ہوں گے۔ ہے نا؟ اور جب آپ اتنے خراب حوالوں کے ساتھ پاکستان سے اتنی محبت کرتے ہیں تو اچھے حوالے اس محبت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیں گے' اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور اچھے حوالوں کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں۔ دیکھیں نا.......... پاکستان صرف خیال نہیں' حسین ترین خیال سے کہیں حسین ایک حقیقت ہے۔ پاکستان صرف نظریہ نہیں' روح نہیں' ایک خوب صورت اور شاداب جسم بھی ہے۔ یہاں دنیا کی سب سے خوبصورت اور اچھوتی وادی کاغان بھی ہے' نامعلوم گہرائی والی پریوں کی جھیل سیف الملوک بھی ہے اور سربہ فلک برف پوش پہاڑی چوٹیاں بھی۔ فصلوں کا سونا اگلنے والی زمین بھی ہے اور زمین میں چھپے ہوئے معدنیاتی خزانے بھی۔ یہاں پُرہیبت صحرا بھی ہیں اور سرسبز وادیاں بھی۔ یہ سب کچھ دیکھا ہے آپ نے؟ نہیں..........

اب آپ خود بتائیں' آپ پاکستان کو دیکھیں گے ہی نہیں تو آپ یہ کیسے جان سکیں گے کہ اللہ نے آپ کو کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ آپ اپنے محبوب کے حسن کی نظرنوازی سے واقف ہی نہ ہوں تو اس سے کتنی محبت کریں گے.......... اور واقف ہو جائیں تو کتنی کریں گے۔ تو میرے خیال میں محبت کے ناتے یہ آپ کا فرض ہے کہ اپنے محبوب کے حسن سے پوری طرح شناسائی حاصل کریں.......... اچھے حوالے جمع کریں۔ تب آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ آپ کی محبت درحقیقت کتنی کم ہے.......... اور کتنی زیادہ ہونی چاہیے۔

اور سنیں.......... آپ اتنا حسین وطن ملنے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں؟ یقینا کرتے ہوں گے لیکن کس طرح؟ دیکھیں' شکر ادا کرنے کے تین طریقے ہیں۔ دل سے' زبان سے اور عمل سے۔ دل میں شکر گزاری ابھرتی ہے اور زبان تک آجاتی ہے۔ لفظوں میں ڈھل جاتی ہے لیکن یہ شکر گزاری قطرے جیسی ہوتی ہے۔ جیسے کہیں سے دل کے پتے پر کوئی قطرہ گرے' چند لمحے رکے اور پھر ٹپک جائے۔ اس شکر گزاری سے نہ آدمی کی تشفی ہوتی ہے اور نہ حق شکر گزاری ادا ہوتا ہے۔ شکر تو عمل سے شروع ہو کر عمل پر ہی ختم ہونا چاہیے۔ تب وہ ختم نہیں ہوتا۔ دھڑکنوں میں سما جاتا ہے' سانسوں میں رچ بس جاتا ہے۔ وجود میں ہر پل موجزن رہتا ہے۔ پہلے مرحلے میں عملی شکر استفادہ ہے۔ خدا نے جو نعمت عطا فرمائی' اس سے استفادہ کریں' حظ اٹھائیں۔ کھانے کی چیز کو کھائیں' دیکھنے کی چیز کو دیکھیں اور استعال کی چیز

کو استعمال کریں۔ یہ شکر کا پہلا درجہ ہے۔ سو آپ میرے.......... اپنے پاکستان کی
بے اندازہ خوب صورتی کو دیکھیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ پہلے آپ کا
دل.......... اور چند لمحوں میں پورا وجود محبت اور شکر گزاری سے لبالب بھر جائے
گا.......... یوں کہ آپ کی زبان شل ہو جائے گی۔ لفظ ٹھٹھر جائیں گے۔ عاجز اور بے
وقعت ہو جائیں گے۔ اس لمحے آپ قلزم ہوں گے اور آپ کی شکر گزاری کی
موجیں اچھل کر اس خدائے واحد کی بارگاہ تک پہنچیں گی' ہر شکر جس کے لیے
ہے۔ اور شکر کا جاریہ اور آخری مرحلہ بھی عمل ہے۔ آپ وطن کے لیے اپنی
حیثیت سے بڑھ کر کچھ کریں گے۔ کرتے رہیں گے تو وہ شکر جاریہ ہو گا۔

ایک اور بات بتائیں گے؟ اگر آپ زمین پر چل رہے ہوں اور اچانک چھوٹے
چھوٹے بادلوں کی ٹکڑیاں نیچے اتر آئیں اور آپ کو چُھو لیں.......... آپ سے لپٹ
جائیں تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟ کیسا لگے گا آپ کو؟ ممکن ہے' آپ جواب دیں
کہ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ یا کہیں کہ ایسا تو صرف خوابوں میں ہو سکتا ہے لیکن میں
آپ کو بتاؤں' پہاڑی مقامات پر ایسا ہوتا ہے۔ چلتے چلتے اچانک آپ کو احساس ہوتا
ہے کہ ایک چھوٹی سی بدلی آپ کے سامنے نیچے اترتی چلی آرہی ہے۔ آپ ٹھٹک کر
رک جاتے ہیں۔ وہ بدلی آپ کی آنکھوں کے عین سامنے آجاتی ہے۔ تب آپ کو پتا
چلتا ہے کہ وہ بے رنگ نہیں' پھر بھی شفاف ہے اور وہ اتنی لطیف ہے کہ آپ اس
کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ایسی ہوتی ہے جیسے سخت سردی میں آپ کی سانس
دھوئیں کی طرح نظر آتی ہے۔ بس بدلی اس سے بہت زیادہ لطیف ہوتی ہے اور جب
وہ آپ کو چھوتی ہے' آپ کے چہرے سے.......... جسم سے ٹکراتی ہے تو خنکی
کا.......... نمی کا بس احساس دلاتی ہے.......... صرف احساس۔ ہاں' آپ اندر سے
بھیگ جاتے ہیں.......... شرابور ہو جاتے ہیں۔ آپ اس لمحے جھانک سکیں تو دیکھ لیں
کہ آپ کے سینے کے اندر کے بے کراں آسمان پر افق تا افق بہت بڑی دھنک نکل
آئی ہے.......... سات چمک دار رنگوں کی کمان اور اس دھنک کے ساتوں رنگ آپ
کی آنکھوں میں اتر آتے ہیں۔ ایسے میں آپ جس چیز کو دیکھیں' اچھی لگتی ہے۔
جس شخص کو دیکھیں' خوب صورت لگتا ہے۔ آپ کو ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے۔
اس لیے کہ اس وقت آپ محبت سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ بہت خطرناک وقت ہوتا
ہے۔ خاص طور پر صنف مخالف کے معاملے میں۔ اس وقت کی کیفیت پر.......... اس
کشش پر کبھی اعتبار نہ کیجئے۔ میں خود بھی اس عالم میں دھوکا کھا چکا ہوں۔ میرا مشورہ
ہے کہ ایسے میں باطن کی اس دھنک کے تحلیل ہونے کا انتظار کیجئے۔ یہ بھی سن لیں
کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ تحلیل ہوئی تو چند لمحوں میں ہو گئی' نہیں ہوئی تو مہینوں
بھی نہیں ہوگی۔ بہرحال جب وہ تحلیل ہو گی تو آپ کو اپنے مطلوب و محبوب و
ممدوح کے اصل خدوخال.......... اصل رنگ نظر آئیں گے۔ اس کا چہرہ بے رحم
دھوپ میں واضح اور صاف نظر آئے گا۔ نتیجہ مایوس کن ہو تو محبت سے آدمی کا
اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی کہ دھنک تحلیل ہونے کے بعد بھی
اپنے محبوب کے خدوخال اور رنگ آپ کو ویسے ہی نظر آئیں۔

البتہ اپنے وطن کے رنگ سدا بہار اور سچے رنگ ہیں!

علیم الحق حقی

ٹوور پارٹی کا وہ مری میں دوسرا دن تھا۔ جبکہ مجھے مری پہنچے ایک گھنٹا ہی ہوا ہو گا۔ میں کچھ مصروفیات کی وجہ سے کراچی سے سیاحتی پارٹی کے ساتھ روانہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے سرممنون سے طے کیا تھا کہ سرحد ویو ہوٹل مری میں پارٹی سے آملوں گا۔ سو دوسری شام سوا چار بجے میں مری پہنچا تو پارٹی کے لوگ ہوٹل کے سامنے سبزہ زار پر حسب حیثیت و مراتب اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ بچے کھیل میں مصروف تھے۔ لڑکیاں دو ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ایک ٹولی کسوٹی کھیل رہی تھی اور دوسری کھوکھو۔ مردوں کا ایک گروپ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہاں لطیفوں کا دور چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اختر صاحب نے نعرہ لگایا "لو بھئی.......... ظفر بھی آگئے۔"

اس نعرے سے کئی لوگوں کا انہماک ٹوٹا۔ کسوٹی میں مصروف میری عم زاد سائرہ چونک کر اٹھی ہوٹل کے کمرے سے نعیم برآمد ہوا۔ میں کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی ان لوگوں میں گھر گیا۔ نعیم نے میرے ہاتھ سے بیگ اور بریف کیس لے لیا۔ سائرہ نے سفر کا احوال پوچھا۔ میں نے کہا "سفرنامہ لکھوں گا۔ اس میں پڑھ لینا۔"

وہ ہنسنے لگی "سفرنامہ لکھیں گے۔ خط تو لکھا نہیں جاتا آپ سے۔ کس کس کو شکایت ہے..........."

اتنے میں طاہر آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ ٹوور پر روانگی سے چند روز پہلے پارٹی میں شریک لوگوں کی تعارفی میٹنگ سرممنون

کی ایک اچھی روایت ہے۔ یوں اجنبی لوگ ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہ رہے اور انہیں ٹوور کے دوران پیش آنے والے ممکنہ مسائل سے روشناس بھی کرا دیا جائے۔ میں اس پارٹی کے تجربہ کار لوگوں میں سے تھا اور ابھی جوانی کی حدود میں بھی تھا۔ شاید اس لیے نوجوان لڑکے ہمیشہ مجھ سے بہت قریب ہو جاتے تھے۔ طاہر بھی اس ایک ملاقات میں میرے بہت قریب آگیا تھا۔ ویسے وہ تھا بھی بہت تیزی سے قریب آنے والا مخلص لڑکا۔ "بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں ظفر بھائی۔" اس نے پرخلوص لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تھکا ہوا تھا" میں نے کہا "لیکن مری میں تھکن کا کوئی کام نہیں۔ تھکن یہاں پہنچتے ہی دور ہونی شروع ہو گئی ہے۔ ابھی نہا کر کپڑے بدلوں گا تو بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔"

"بس بھائی جان.......... آپ جلدی سے جائیں اور جلدی سے آئیں" سائرہ نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا "پتا ہے' ہم آپ کے انتظار میں کہیں گھومنے بھی نہیں گئے۔"

"میں یہ گیا اور وہ آیا" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

دس منٹ بعد میں کرتہ پاجامہ پہنے باہر نکلا تو تھکن واقعی ڈھل چکی تھی۔ میں نے احتیاطاً چادر کندھے پر ڈال لی تھی۔ مری کا کچھ پتا نہیں' اچانک بارش ہو جاتی ہے اور سردی ہو جاتی ہے۔ باہر ایک اچھا خاصا گروپ بن چکا تھا۔ نعیم اور طاہر تھے' اختر' شمس اور انیس صاحب تھے اور سائرہ تھی۔ "تیار ہیں بھائی جان!" سائرہ نے پوچھا۔

"بالکل تیار ہوں۔"

"کہاں چلیں گے؟"

"جہاں سب چاہیں۔"

"تو کشمیر پوائنٹ چلتے ہیں" سائرہ نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

سائرہ نے لڑکیوں کی ٹولیوں کی طرف رخ کر کے پکارا "چلو بھئی.......... جو سیر کو

چلنا چاہے' ہمارے ساتھ آجائے۔"

اس طرف سے تین لڑکیاں ہماری طرف آئیں اور سائرہ کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں نے سرسری انداز میں تینوں کو دیکھا۔ سائرہ نے تعارف کرایا "بھائی جان! یہ نغمہ ہے' یہ راحیلہ اور یہ ہے صائمہ" پھر وہ ان کی طرف مڑی "اور یہ ہیں میرے بھائی جان۔"

"بھائی جان تو تمہارے ہیں" صائمہ بولی "ویسے ان کا کوئی نام بھی ضروری ہو گا۔ اب میں تو انہیں بھائی جان کہنے سے رہی۔"

"میرا نام ظفر ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیوں بھئی.......... بھائی جان کیوں نہیں کہہ سکتیں؟" سائرہ نے صائمہ پر آنکھیں نکالیں "چلو.......... ظفر بھائی کہہ لو۔"

"میں یونہی کسی کو بھائی وائی نہیں کہتی" صائمہ نے بے نیازی سے کہا۔

سائرہ کے تیور خراب ہو رہے تھے۔ میں نے تیزی سے مداخلت کی "اب باتیں ہی کرتے رہو گے تم لوگ یا چلو گے بھی۔"

ہم باہر نکل آئے۔ لوگ جب بڑے گروپ کی شکل میں چلتے ہیں تو کئی چھوٹے گروپس میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ یہ تقسیم کئی اعتبار سے ہوتی ہے۔ اس میں کچھ چلنے والوں کی رفتار کا دخل ہوتا ہے۔ بہت تیز چلنے والے' تیز چلنے والے' میانہ رو اور سست چلنے والے۔ ہمارے گروپ میں ایک اور بات تھی۔ لڑکیاں ایک گروپ کی شکل میں درمیان میں چل رہی تھیں۔ اختر' انیس اور شمس صاحب نے نعیم کو گھیر لیا تھا اور وہ سب سے آگے تھے۔ طاہر ابتدا ہی سے میرے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ لہٰذا ہم سب سے پیچھے تھے۔

"کہو بھئی.......... سفر کیسا رہا؟" میں نے طاہر سے پوچھا۔

"پرلطف" اس نے جواب دیا۔

"کوئی پھول وغیرہ بھی کھلایا کسی نے؟"

"پھول؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"دراصل گل کھلانا بہت بھاری محاورہ ہے.......... اور ہماری صورت حال سے مطابقت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے میں اسے پھول کھلانا کہتا ہوں" میں نے وضاحت کی

"میرا مطلب ہے، کوئی رومانس وغیرہ؟"

"میرا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" اس نے جواب دیا "یہاں کوئی ایسی لڑکی نہیں، جو مجھے پسند آسکے اور فلرٹ کا میں قائل نہیں۔"

"دیکھو طاہر، ایک بات یاد رکھنا" میں نے سنجیدگی سے کہا "سفر انسانوں کو بدل دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت کے خفیہ و خفتہ گوشے سفر کے دوران بے نقاب ہونے لگتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو خود آدمی کے لیے بھی انکشاف ہوتے ہیں۔"

"بے خبر لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا" طاہر نے کہا "ورنہ ہر شخص سب سے بہتر طور پر خود کو جانتا ہے۔"

"میرا خیال مختلف ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"خود کو جاننا اور سمجھنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اس کا اعتراف تو علامہ اقبال نے بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں.......... اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے" میں کہتے کہتے رکا "سنو.......... ایک بات بتاؤ، یہ لڑکی نغمہ کیسی لگی تمہیں؟"

"نغمہ!" اس نے دہرایا اور آگے چلتی ہوئی نغمہ کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد بولا "بہت خاموش طبع اور ریزرو لڑکی ہے۔ چھچھورا پن بھی نہیں ہے اس میں۔ زیادہ گھلتی ملتی نہیں کسی سے۔ کسی معاملے میں ملوث نہیں ہوتی۔ غیر ضروری کا تو سوال ہی نہیں، بعض اوقات جہاں بولنا ضروری ہو، وہاں بھی نہیں بولتی۔"

"ہوں.........." میں نے پُرخیال لہجے میں کہا "تب شاید سب سے پہلے تم اسی کو تبدیل ہوتے دیکھو گے۔"

"کیا.......... کیا مطلب؟" وہ حیران رہ گیا۔

"دیکھ لینا۔ اچھا یہ بتاؤ، مری کیسا لگا؟"

"بہت حسین۔ واقعی ہمارا وطن بہت خوب صورت ہے۔"

"ابھی کہاں۔ حسن تم دیکھو گے تو تمہاری سانسیں رکنے لگیں گی۔ یہ تو خوب صورتی کی سرحد ہے، جس میں ابھی تم نے قدم رکھا ہے۔"

"آپ میرا اشتیاق بڑھا رہے ہیں۔"

"اب میں نہیں، ہر نیا حسین نظارہ تمہارا اشتیاق بڑھائے گا۔"

"سر ممنون واقعی بڑا کام کر رہے ہیں" وہ بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

موڑ مڑتے ہی وہ سڑک آگئی جس کے دونوں طرف ہوٹل اور ریسٹورنٹ تھے۔ آگے جانے والے دونوں چھوٹے گروپ ٹھہر گئے تھے۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ ایک طرف تین میزیں ملا کر ایک لمبی میز بنا دی گئی تھی۔ ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے نے آکر پوچھا "کیا لاؤں صاب؟"

"دس چائے دودھ پتی لاؤ فسٹ کلاس لیکن بغیر چینی کی۔"

"بغیر چینی کی!" لڑکے نے حیرت سے دہرایا۔ سائرہ اور نعیم کے علاوہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں.......... چینی الگ سے لانا۔"

لڑکا چلا گیا۔ تب میں نے وضاحت کی کہ ان علاقوں میں بہت زیادہ میٹھی چائے پی جاتی ہے.......... اتنی کہ ہونٹ تک چپکنے لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ پہاڑی لوگ بہت جفاکش ہوتے ہیں۔ زیادہ شکر پیتے ہیں اور وہ توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم شہری لوگوں کو تو ایک ہفتے میں شوگر ہو جائے۔ پہلی بار میں ان علاقوں میں آیا تو مجھے شیرینی کا تلخ تجربہ ہوا۔ میں نے اس کی ترکیب یہ نکالی کہ فسٹ کلاس دودھ پتی کے ساتھ پتی زیادہ اور چینی کم کی فرمائش کرتا تھا مگر فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کے معیار سے کم چینی بھی میرے حساب سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تب میں نے بغیر چینی کی چائے طلب کرنا شروع کی اور مسئلہ حل ہو گیا۔

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے کسی کی نظروں کی چبھن کا احساس ستا رہا تھا۔ میں

نے اس طرف دیکھا۔ صائمہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سا تاثر تھا جسے کچھ تجسس' کچھ سنسنی اور کچھ حیرت ہی کہا جا سکتا تھا لیکن مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ تاثر بدل گیا۔ اب ان آنکھوں میں برہمی تھی.......... بے مہری تھی۔ میں نے جلدی سے نظریں ہٹالیں۔ میں دوسری چوٹ کھانے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

لڑکا چائے لے آیا۔ چینی کے معاملے میں سب نے اپنی مدد آپ کی۔ چائے پینے کے دوران میں غیر محسوس طور پر سب کو بغور دیکھتا رہا۔ تینوں ٹیچر صاحبان کو تو میں پہلے سے جانتا تھا۔ تینوں لڑکیاں البتہ میرے لیے نئی تھیں۔ لہٰذا میں ان کا جائزہ لے رہا تھا۔

جو کچھ میں نے دیکھا' اس نے نغمہ کے بارے میں میرے پہلے تاثر کی تصدیق کر دی۔ وہ بظاہر خاموش طبع تھی لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی لیکن خوب صورت اور بے حد چمکیلی آنکھیں تھیں۔ ان میں جو چمک تھی' وہ شوخی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ چہرے کے تیکھے نقوش گواہی دیتے تھے کہ اس کی زبان جو اس وقت کسی وجہ سے خاموش ہے' قینچی کی طرح چلتی ہوگی۔ میرا تاثر یہ تھا کہ وہ بدتمیز بھی ہوگی۔

دوسری لڑکی راحیلہ خوب صورت مگر عام سی لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیوں کی عام طور پر کسی معاملے میں اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ کہیں کسی گروپ میں عام تبادلہ خیال ہو رہا ہو تو ایسی لڑکیاں عام طور پر کبھی کسی کی اور کبھی کسی کی تائید کرتی رہتی ہیں۔ ان کا پسندیدہ جملہ ہوتا ہے.......... ٹھیک کہا آپ نے۔

تیسری صائمہ کچھ مختلف اور غیر معمولی لگتی تھی۔ رنگت اس کی دبتی ہوئی تھی لیکن نقوش بہت خوبصورت تھے۔ آنکھیں نہ زیادہ بڑی تھیں اور نہ بہت چھوٹی۔ ان میں ذہانت اور خود اعتمادی کی چمک تھی۔ ٹھوڑی بہت مضبوط تھی۔ حلیہ اس کا عجیب تھا۔ پھول دار سوتی کپڑے کی قمیض' سفید شلوار اور پیروں میں جاگرز' شلوار ذرا اونچی تھی چنانچہ صاف نظر آرہا تھا کہ اس نے موزے نہیں پہنے ہیں۔ اس کے انداز میں خود سے بھی بے نیازی تھی۔

میں نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور باہر دیکھنے لگا۔ شمس صاحب انسپکٹریٹ کا کوئی قصہ سنا رہے تھے۔ لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں بڑی طمانیت محسوس کر رہا تھا اور اپنے آپ میں مگن تھا۔ ایک طویل کش لے کر میں نے دھواں اگلا۔ اچانک مجھے پھر نظروں کی چبھن کا احساس ہوا۔ میں نے سر گھما کر صائمہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی توجہ سے سائرہ کی بات سن رہی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ ایک لمحہ پہلے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں پھر باہر دیکھنے لگا۔

"مجھے سگریٹ پینا بہت اچھا لگتا ہے۔"

اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ صائمہ تھی اور لڑکیوں سے مخاطب تھی۔ لڑکیوں نے ادھر ادھر دیکھا اور خفت سے ہنسنے لگیں۔

صائمہ نے انہیں گھورا "مذاق نہیں۔ میں سگریٹ پیتی ہوں۔" وہ بولی۔

"تم سچ مچ سگریٹ پیتی ہو؟" سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں' میں ہر سال دو سگریٹ پیتی ہوں" صائمہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی' "گھر والوں سے چھپ کر نہیں' ڈیڈی سے لے کر۔"

"کوئی تمہیں منع نہیں کرتا؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا' سگریٹ میں ڈیڈی سے لیتی ہوں۔"

"سال میں دوبار..........!" سائرہ اب بھی حیران تھی۔

تمام لوگ اب صائمہ کی طرف متوجہ تھے۔ اختر اور شمس صاحب کی نگاہوں میں ملامت تھی۔ نعیم' طاہر اور انیس صاحب اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں' سال میں دوبار اور صرف دو سگریٹ" صائمہ نے جواب دیا "ایک عید کے دن اور دوسرا اپنے برتھ ڈے پر۔"

"اور اگر کسی سال تمہارا برتھ ڈے عید کے دن آیا تو کیا کرو گی؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"اب تک تو ایسا نہیں ہوا" صائمہ نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ایسا ہوا تو اس روز

میں دو سگریٹ پیوں گی۔ واہ............ کتنا مزہ آئے گا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

"اگر اتنا ہی شوق ہے تو ہر روز............ اور جی بھر کے سگریٹ کیوں نہیں پیتیں؟"

سائرہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"پی سکتی ہوں لیکن پیتی نہیں اور کبھی نہیں پیوں گی۔"

"کیوں بھئی؟"

"میں آزادی کی قدروقیمت جانتی ہوں۔" صائمہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا "آزادی برقرار رکھنے کے لیے خود پر پابندیاں عائد کرنا پڑتی ہیں ورنہ آزادی چھن جاتی ہے اور شرمندگی الگ ہوتی ہے۔ ممی ڈیڈی مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو اس اعتماد پر پورا اترنا میرا فرض ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں سبحان اللہ کہا اور دوسروں کی طرف دیکھا۔ بیشتر ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹیں تھیں۔ البتہ کچھ نگاہوں میں ستائش بھی تھی۔ میں نے لڑکے کو بلا کر چائے کے پیسے دیے اور ہم باہر نکل آئے۔

گروپ اب بھی پہلے جیسے تھے لیکن ترتیب بدل گئی تھی۔ اب میں اور طاہر سب سے آگے تھے اور لڑکیاں سب سے پیچھے تھیں لیکن درمیانی فاصلہ پہلے کی نسبت کافی کم تھا۔ طاہر نے چلتے چلتے اچانک دھیمی آواز میں پوچھا "یہ صائمہ کیسی لگی آپ کو؟"

"ٹھیک ٹھاک۔ کوئی خاص بات نہیں" میں نے بے تعلقی سے کہا۔

"خاص بات تو ہے۔ وہ آپ میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

مجھے طاہر کے لہجے میں شرارت محسوس ہوئی۔ میں چڑ گیا۔

"ایسے تو ہر شخص ہر دوسرے شخص میں دلچسپی لیتا نظر آئے گا تمہیں۔"

"نہیں ظفر بھائی۔ یہ عام دلچسپی نہیں، خصوصی دلچسپی ہے۔ آپ نے اس کی نظریں نہیں دیکھیں اور پھر اس نے شروع میں واضح کر دیا تھا کہ وہ آپ کو بھائی نہیں کہے گی۔"

"اور مجھے یہ بات اچھی لگی۔ یہ بھائی بہن بننے بنانے کا چکر مجھے اچھا نہیں لگتا۔

رہی نظروں کی بات............ تو وہ میں نے دیکھی تھیں۔"

"اور پھر بھی............"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ اس کا درد سر ہے، میرا نہیں۔ میں سفر کے دوران اس قسم کے چکر میں پڑنا پسند نہیں کرتا۔ سفر............ اور اتنا خوب صورت سفر! میں جانتا ہوں کہ ایسے میں آدمی کے اندر محبت مچلنے لگتی ہے اور وہ سامنے آنے والے پہلے ہی شخص پر بغیر سوچے سمجھے فریفتہ ہو جاتا ہے۔ وہ وقتی کشش ہوتی ہے۔ فلرٹ ٹائپ لوگوں کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن سنجیدہ لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ میں تو بھائی وطن کو دیکھنے............ حسن فطرت کو سراہنے کی غرض سے نکلا ہوں۔ مجھے رومانس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"لیکن صائمہ............"

"میں نے کہا نا، مجھے کوئی دلچسپی نہیں" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"چند لمحے خاموشی رہی۔ ہم چلتے رہے۔ پھر طاہر نے کہا "ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

اس کے لہجے میں جو ڈر تھا، اس کی وجہ سے مجھے اس پر پیار آگیا۔ وہ اپنی پُرخلوص طبیعت سے مجبور تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کہو............ میں برا نہیں مانوں گا۔"

"یہ جو آپ نے کہا کہ صائمہ ٹھیک ٹھاک لڑکی ہے، یہ تو زیادتی ہے۔ مجھے تو وہ بہت مختلف............ بہت اچھی لگی۔"

میں ہنس دیا "تو یوں کہونا۔ تمہیں اچھی لگی ہے وہ۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہم سفر لڑکیوں میں سے کسی نے مجھے اپیل نہیں کیا۔"

"لو............ تم خود برا مان گئے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ اب خوب صورتی کا سفر شروع ہو گیا ہے۔ اسے انجوائے کرو۔ یہاں سے واپس جاؤ گے تو بعض قومی نغمے اپنی شاعری اور دھن سمیت تمہارے اندر گونج رہے ہوں گے۔ پاکستان سے عشق کرنے

والے شاعروں نے جو نغمے تخلیق کیے ہیں' پاکستان دیکھنے کے بعد وہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ وہ نغمہ سنا ہے تم نے.......... تری وادی وادی گھوموں' ترا کونا کونا چوموں' تو میرا دلبر جان' تو میرا پاکستان.........."

"جی ہاں سنا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔"

"ابھی تم اس نغمے کی روح کو محسوس نہیں کر سکے ہو۔ واپس جاؤ گے تو اس تک بھی رسائی ہو چکی ہوگی اور یہ نغمہ تمہارے دل کی دھڑکن بن چکا ہوگا۔ پھر سوچنا کہ شاعر کو پاکستان سے کیسا عشق ہے۔ کتنا کچھ محسوس کیا ہوگا اس نے تو یہ نغمہ تخلیق ہوا ہوگا۔"

ہم بڑھتے رہے۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑ تھا اور دوسری طرف سرسبز گھاٹیاں۔ گھاٹیوں میں بلند و بالا درختوں نے جنگل کی سی فضا بنا دی تھی' "سڑک پر چلنا ضروری ہے کیا؟" طاہر نے پوچھا "ہم نیچے اتر کے بھی چل سکتے ہیں۔"

"اس میں بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔ ہم یہاں کے رہنے والے ہوتے تو اور بات ہوتی۔"

"کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ یہاں تو بھٹکنا بھی پُرلطف ہوگا۔" وہ ضد کرنے لگا۔

ہم رک گئے۔ دوسرا گروپ آگے آیا تو میں نے نعیم سے کہا "تم چلو.......... ہم ذرا بھٹک کر آتے ہیں۔ کشمیر پوائنٹ پر ملاقات ہوگی۔"

وہ لوگ سیدھے چلتے گئے۔ میں اور طاہر کچے میں اتر گئے۔ "سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں تو ایسا بھٹکنے کا امکان بھی نہیں۔" طاہر نے کہا۔

میں مسکرا دیا۔ جو کچھ جانتا تھا' اسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی اچھا یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو خود سمجھنے کا موقع ملے۔

سڑک سے اترنے والی ڈھلوان ہمیں سڑک سے خاصا دور لے آئی تھی۔ ہمارے پیروں تلے سبزہ تھا' جس پر غروب ہوتے سورج کی ہلکی زرد دھوپ مچل رہی تھی۔ ہم ایک کچی پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ راستے میں نازک پہاڑی پھولوں کی خود رو جھاڑیاں جا بجا نظر آئیں۔ پگڈنڈی اب اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ آگے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا

تھا۔ ہم اس میں داخل ہوئے۔ درخت ایک دوسرے سے بہت قریب نہیں تھے پھر بھی وہ اچھا خاصا جنگل تھا۔ کہیں خنک سا ہلکا اندھیرا تھا اور کہیں دھوپ اچانک راستہ بنا کر نیچے اتر آتی تھی۔ ایک آنکھ مچولی سی ہو رہی تھی۔ درختوں کا سلسلہ سطح زمین پر ختم ہوا پھر جو ہم نے بائیں جانب دیکھا تو سڑک ندارد۔

"اب بولو.......... سڑک غائب ہو گئی نا" میں نے کہا۔

"واقعی" طاہر نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "لیکن جائے گی کہاں۔ بالآخر مل جائے گی۔ بس بائیں جانب چلتے رہیں۔ ویسے لطف آگیا ظفر بھائی!"

ہم پگڈنڈی سے ہٹ کر بائیں جانب چل دیے۔ یہ وہ موقع تھا جب وہ صورت حال پیش آئی جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ مجھے اچانک ہی وہ بدلی جھکتی.......... زمین کی طرف لپکتی نظر آئی۔ "طاہر.......... طاہر.......... ادھر دیکھو" میں نے اسے پکارا۔

طاہر نے بادل کے اس ٹکڑے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ان میں معصوم بچوں کی سی حیرت اور تجسّس جھلکنے لگا۔ "واہ.......... سبحان اللہ" اس نے بے ساختہ کہا "ظفر بھائی' یہ تو بالکل نیچے آرہی ہے۔ میں اسے مٹھی میں پکڑ سکتا ہوں۔"

اتنی دیر میں وہ شریر بدلی اس کی آنکھوں کی سطح تک آگئی تھی اور اس نے رخ بھی اسی کی طرف کیا تھا۔ طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اسے چھوا۔ میں اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوشی.......... اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک دیدنی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلایا اور بادل کے اس ٹکڑے کو جیسے اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوب صورت حیرت چمکی۔ میں اس کے محسوسات کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی بند مٹھی کے اندر ہلکی سی خنکی کا.......... نمی کا بہت موہوم سا احساس ہوا ہوگا۔

پھر اچانک اسے احساس ہوا اور اس نے دیکھا کہ بادل کا وہ لطیف ٹکڑا اس کی مٹھی سے باہر ہے اور حرکت کر رہا ہے.......... شرما کے بھاگی ہوئی کسی حسین اور شوخ و شریر لڑکی کے آنچل کی طرح دور ہوتے ہوئے' اشارے سے اسے بلا رہا ہے۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر گویا اس آنچل کو تھامنے کی کوشش کی لیکن بدلی کے تو ہوا کے پر لگے

تھی۔ وہ لہراتی ہوئی تیزی سے دور ہوتی گئی۔ طاہر نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا اور پھر ٹھٹک گیا۔ بدلی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اپنے داہنے ہاتھ کی بند مٹھی کو حیرت سے دیکھا.......... اور اگلے لمحے یوں دھیرے دھیرے اسے کھولا جیسے یقین ہو کہ مٹھی میں سے اس بدلی کا کوئی ٹکڑا برآمد ہو گا۔

لیکن مٹھی میں کچھ بھی نہیں تھا!

میں طاہر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ خالی مٹھی دیکھ کر ایک لمحے کو وہ اس بچے کی طرح افسردہ ہوا' جس کا چاند کھلونا آسمان پر چلتے چلتے کوئی سیاہ بادل اوڑھ بیٹھا ہو۔ پھر اس کی آنکھوں میں جیسے دھنک کے ساتوں رنگ اتر آئے۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ اندر سے بھیگ گیا ہے۔ شرابور ہو گیا ہے اور اس کے سینے کے اندر کے بے کراں آسمان پر افق تا افق بہت بڑی دھنک نکل آئی ہے۔ سات چمک دار رنگوں کی کمان! اور اس کی آنکھوں میں اترے ہوئے رنگ اسی دھنک کے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا.......... لیکن میں جانتا تھا کہ اب وہ خطرناک وقت کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔ اب اسے ہر چیز اچھی لگے گی' ہر شخص خوبصورت لگے گا۔ اسے ہر چیز سے محبت ہو جائے گی۔ میں دعا ہی کر سکتا تھا کہ وہ دھنک جلد از جلد تحلیل ہو جائے۔

ہم بائیں سمت چلتے رہے۔ بالآخر سڑک نظر آ گئی۔ ہم سڑک کی طرف چل دیے۔ طاہر کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی ٹرانس میں ہو۔ وہ سحر زدہ سا چل رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔ پہاڑوں کا جادو آہستہ آہستہ اس کے سر پر چڑھ رہا تھا۔ اگرچہ ابھی اس نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔

ہم کشمیر پوائنٹ پہنچے۔ دوسرا گروپ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ انیس صاحب اپنے ساتھ دوربین لائے تھے۔ اب سب باری باری اس چوٹی کو دیکھ رہے تھے جو کشمیر میں تھی۔ اس وقت صائمہ دوربین آنکھوں سے لگائے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور سائرہ کی طرف بڑھا دی۔

"یہ ہے کشمیر پوائنٹ" میں نے طاہر کو بتایا۔

"کشمیر پوائنٹ کیوں کہتے ہیں اسے؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں سے کشمیر دکھائی دیتا ہے" میں نے کہا پھر سائرہ سے کہا "ذرا دوربین ادھر دینا" سائرہ سے دوربین لے کر میں نے طاہر کی طرف بڑھائی اور اس پہاڑی چوٹی کی طرف اشارہ کیا جو کشمیر کا حصہ ہے۔ "دوربین لگا کر اس چوٹی کو دیکھو۔ تم خود کو کشمیر میں پاؤ گے۔"

اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور اس طرف دیکھنے لگا۔ دیر تک وہ دوربین لگائے رہا اور جب دوربین آنکھوں سے ہٹائی تب بھی صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بادلِ ناخواستہ ہٹائی ہے "کیسا خوبصورت منظر ہے" اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اب پہاڑوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ میں پہلی بار کشمیر پوائنٹ آیا اور میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہ عام سا منظر تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پہاڑوں پر ایسے مناظر کی کوئی کمی نہیں۔ میں نے غور کیا اور سمجھ لیا کہ یہ سیر کے لیے آنے والوں میں اس ہل اسٹیشن کی کشش میں اضافے کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ سیر کرنے والوں کو ایک نسبتاً طویل چہل قدمی کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ سوچ کر بھی وہ خوش ہوتے ہوں گے کہ انہوں نے مری کا ایک خاص الخاص مقام دیکھ لیا ہے لیکن سحر زدہ طاہر کو وہ منظر غیر معمولی حد تک خوب صورت لگا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ خوب صورتی کے طلسم میں گرفتار اس کے تخیل نے اس چوٹی سے نیچے اتار کر اسے کشمیر کی سیر کرا دی ہو۔

شام کا جھٹ پٹا بہت خاموشی سے اتر آیا تھا اور سورج بہت تیزی سے سامنے والے پہاڑ کی طرف جھک رہا تھا۔ "طاہر.......... اب ذرا غروب آفتاب کا منظر بھی دیکھ لو۔ یہ منظر ہم شہر والوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے کو دوربین ہٹا کر سورج کو دیکھا اور پھر دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگالی "ابھی تو دیر ہے غروب آفتاب میں۔ میں ذرا وہ منظر اور دیکھ لوں" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں احساس بھی نہیں ہوگا اور سورج غرب ہو چکا ہوگا" میں نے آہستگی سے دوربین اس سے لے لی۔

وہ کچھ بدمزہ سا ہوا۔ تاہم اس نے سورج کی طرف دیکھا.......... اور دیکھتے ہی بری طرح چونکا "ارے واقعی.......... ایک پل میں یہ سورج کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔"

"سچ.......... یہ تو کسی گیند کی طرح لڑھک رہا ہے" راحیلہ بولی۔

طاہر نے ایک پل اسے دیکھا اور پھر دوبارہ نیچے گرتی ہوئی نارنجی گیند کی طرف متوجہ ہوگیا۔

چند ہی لمحوں میں سورج پہاڑ کے پیچھے اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹتے پرندوں کے چہچہے بھی معدوم ہو گئے۔ فضا پر عجیب سا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

"کتنا اداس سناٹا ہے۔" طاہر نے کہا۔

"دراصل پرندوں کے چہچہے ختم ہو گئے ہیں" میں نے وضاحت کی "وہ سب بسیرے کے لیے اپنے آشیانوں میں دبک گئے ہیں۔"

فضا نے سب کے موڈ کو متاثر کیا تھا۔ ہم واپس چل دیے۔ اس بار فارمیشن مختلف تھی۔ سب ایک گروپ کی شکل میں چل رہے تھے۔ اداسی لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔

"بھائی جان.......... ابھی ہوٹل نہیں چلیں گے" سائرہ نے اچانک مجھے مخاطب کیا "جناح روڈ کی سیر کریں گے۔"

لڑکیوں نے تائید کی۔ اختر صاحب بولے۔ "بھئی تم لوگ جاؤ۔ ہمیں اپنے اپنے اسکول کے طلباء کا خیال بھی رکھنا ہے۔ ہم ہوٹل جائیں گے۔ مائنڈ نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے اختر صاحب" میں نے جواب دیا۔

اختر، شمس اور انیس صاحب ٹیچر تھے اور تینوں اپنے اسکول کے کچھ طلبا کو اپنی ذمے داری پر اس تفریحی دورے پر لائے تھے۔ انہیں اپنی ذمے داری کا ہمیشہ احساس رہتا تھا۔ آگے جا کر وہ تینوں ہوٹل کی طرف چلے گئے اور ہم جناح روڈ پر مڑ گئے۔ وہاں رونق

قابل دید تھی۔ دو رویہ دکانیں اور ہوٹل روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ ہم یونہی گھومتے پھرے۔ لڑکیوں نے کچھ چھوٹی موٹی شاپنگ بھی کی۔

"اوہ.......... بیوٹی فل۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ صائمہ چلتے چلتے رک گئی تھی اور داہنی سمت ڈریم لینڈ ریسٹورنٹ کو دیکھے جا رہی تھی۔ دوسرے بھی رک گئے۔ "کیا ہوا بھئی؟" راحیلہ نے پوچھا۔

ریسٹورنٹ کا منظر تھا ہی اتنا خوب صورت۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ خود مجھے وہاں رکنے اور کافی پینے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ ریسٹورنٹ اوپری منزل پر تھا۔ محرابی شکل کی کھڑکیاں تھیں، جن کے ساتھ میزیں لگی تھیں۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے پار ہر میز پر رکھے شمع دان میں شمعیں جھلملا رہی تھیں۔

"بیوٹی فل.......... ونڈر فل!" صائمہ نے پھر کہا۔

"چلو بھئی.......... چل کر کافی پیتے ہیں" میں نے پھر کہا۔

"کون پلائے گا؟" صائمہ نے پوچھا۔

"کوئی کسی کو نہیں پلائے گا۔ یہاں کوئی بچہ نہیں، سب خود ہی پئیں گے، اپنی مدد آپ" میں نے شگفتگی سے کہا۔ میں اس کے سوال کی درشتی سے بچنا چاہ رہا تھا۔

"بل بھائی جان ادا کریں گے" سائرہ بولی۔

"لیکن میں اپنا بل خود ادا کروں گی" صائمہ بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو بداخلاقی ہے" سائرہ نے صائمہ کو گھورا۔

"بس اصول کی بات ہے" صائمہ نے ہٹ دھرمی سے کہا "اور میں خوش اخلاق ہوں بھی نہیں۔ لہٰذا بداخلاقی کی پروا بھی نہیں کرتی۔"

"تو بھائی جان، پہلے ہوٹل چلیں، صائمہ کو چھوڑ کر واپس آئیں گے تو.........."

"میں ہوٹل خود بھی جا سکتی ہوں.......... دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔" صائمہ نے چڑ کر کہا۔

خواہ مخواہ کی تلخی اور بدمزگی پیدا ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں نے معاملہ رفع دفع کرنے کی غرض سے کہا "ٹھیک ہے صائمہ بی بی' بل میں ہی ادا کروں گا۔ آپ اپنی کافی کے پیسے بعد میں مجھے دے دیجئے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" صائمہ نے کہا۔ سائرہ منہ بنا کر رہ گئی۔ باقی لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ بڑی ٹیبل کے سامنے کافی کشادہ چرمی سیٹیں تھیں جن پر چار چار آدمی بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں' طاہر' نعیم اور سائرہ ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سامنے والی سیٹ پر صائمہ' راحیلہ اور نغمہ بیٹھ گئیں۔ وہاں بیٹھ کر جناح روڈ کی رونق دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

بیرا کافی کے ساتھ پیسٹریاں اور بسکٹ لے آیا۔ سائرہ کافی بنانے میں مصروف ہو گئی

"ظفر بھائی!" راحیلہ نے اچانک مجھے پکارا۔ "آپ کرتے کیا ہیں' پڑھاتے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' صائمہ نے تڑ سے کہا۔ "مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ ہونی بھی نہیں چاہیے" میں نے بے حد تحمل سے جواب دیا۔

اسے شاید اپنے نامناسب لہجے کا احساس ہو گیا' مدافعانہ لہجے میں بولی "دیکھیں نا' بمشکل بیس دن کا ساتھ ہے۔ اس کے بعد کوئی کسی سے واسطہ نہیں رکھے گا۔ کوئی رابطہ نہیں ہو گا پھر پرسنل ہونے سے فائدہ؟"

"میں آپ سے متفق ہوں بی بی اور میرا تجربہ ہے کہ ہوتا بھی یہی ہے" میں نے کہا۔ درحقیقت اس کی بات سے دل کا ایک پرانا زخم ہرا ہو گیا تھا۔ ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں "لیکن جن لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے' وہ اپنے وقتی ہم سفروں کے متعلق بھی جاننا چاہتے ہیں۔ آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ مس راحیلہ نے مجھ سے ایک بات پوچھی ہے' مجھے اخلاقاً اس کا جواب دینا ہے" یہ کہہ کر میں راحیلہ کی طرف متوجہ ہو گیا "میرا پیشہ معلمی

نہیں' لکھنا لکھانا ہے۔ کہانیاں لکھتا ہوں' جو ڈائجسٹوں میں چھپتی ہیں لیکن میں الجدت اسکاؤٹس اوپن گروپ کا انسٹرکٹر بھی ہوں۔ اسی حیثیت سے اس پارٹی کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔"

راحیلہ یقیناً کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن صائمہ کے اٹیک کے بعد اسے کم از کم مجھ سے مزید کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ سامنے بیٹھے طاہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ طاہر نے کہا "میں بغیر فرمائش کے اپنا تعارف کرا دیتا ہوں۔ یہ میرا انجینئرنگ کا آخری سال ہے۔ میرے والد کی کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ نارتھ ناظم آباد' بلاک ڈی میں رہتا ہوں۔"

اس کے بعد کافی خاموشی سے پی گئی۔ پیسٹریوں کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ کسی کا بھی موڈ خوش گوار نہیں رہا تھا۔ میں نے ماحول کی کشیدگی دور کرنے کی کوشش کی لیکن طاہر کے سوا کوئی تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔ میں اور طاہر آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے پھر بیرا بل لے آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن طاہر اس سے پہلے ہی سو کا نوٹ جیب سے نکال کر طشتری پر رکھ چکا تھا "ظفر بھائی' آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں بھائی!" میں نے ہنستے ہوئے کہا "لوگ جب گروپ کی صورت نکلتے ہیں تو حساب کتاب کا معاملہ نہیں رہتا۔ کم از کم میں بے تکلف ماحول میں ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔"

طاہر نے طشتری پر سے بیرے کے رکھے ہوئے دس کے تین نوٹوں میں سے دو اٹھا لیے۔ بیرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا "حساب کتاب کا معاملہ تو ہے" طاہر نے بیرے کے جانے کے بعد کہا پھر وہ صائمہ کی طرف مڑا "اب آپ مجھے گیارہ روپے اور ۴۲ پیسے دے دیجئے۔ یہ خیال رہے کہ نہ اس سے کم لوں گا نہ زیادہ۔ اتنا ہی حصہ بنتا ہے آپ کا۔"

"شرمندہ نہ کیجئے" صائمہ نے کہا "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں نے غلط بات کی تھی لیکن سوری کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی عادت پڑ جائے تو آدمی احساس کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے اور سوری کہہ کر بری الذمہ ہو جاتا ہے۔"

"شکریہ!" طاہر نے خوش دلی سے کہا "آیئے چلیں۔"

مجھے اس شعلہ و شبنم لڑکی پر بہت زور کا غصہ آیا تھا۔ لگتا تھا' وہ ہمیشہ خود کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

ہم سوا آٹھ بجے ہوٹل واپس پہنچے۔ پارٹی کا باورچی حسین بخش کھانا پکانے میں لگا ہوا تھا۔ لڑکیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے حسین بخش کو سلام کر کے اس کی خیریت دریافت کی۔

"الحمد للہ.......... خیریت سے ہوں لیکن آپ شاید کھانے کا پوچھ رہے ہیں؟"

حسین بخش نے ہنستے ہوئے کہا "آدھا گھنٹا لگے گا۔ مالک صاحب روٹی لینے گئے ہیں۔"

میں باہر نکل آیا۔ کمروں کے سامنے' ہوٹل کی حدود میں ہی ایک سرسبز لیکن غیر ہموار میدان سا تھا۔ وہاں مختلف پارٹیاں موجود تھیں۔ میں اس طرف چلا گیا۔ ایک طرف اسکول کے لڑکوں کی ایک پارٹی اچھل کود کر رہی تھی۔ دوسری طرف لڑکیاں کھو کھو کھیل رہی تھیں۔ سامنے سے مالک صاحب آتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ باورچی کا معاون لڑکا حمید تھا۔ وہ روٹیاں اٹھائے ہوئے تھا۔ میں مالک صاحب کی طرف بڑھ گیا۔ ان سے سلام دعا ہوئی پھر سرممنون نظر آ گئے۔ ان سے میں آتے ہی مل چکا تھا۔

"اس بار کتنے کمرے لیے ہیں آپ نے؟" میں نے سرممنون سے پوچھا۔

"چار" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "اس بار کسی کو خراٹوں سے پریشانی نہیں ہوگی۔ ایک کمرا خواتین کا' ایک انتظامیہ کا' ایک خراٹے لینے والوں کا اور ایک خراٹوں سے گھبرانے والوں کا۔"

"اور کتنے افراد ہیں پارٹی میں؟"

"۷۰ سمجھ لو۔ ۱۰۰ سے زیادہ ہو رہے تھے مگر میں نے خاصے لوگوں کو ڈراپ کر دیا۔ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب ایک بس اور ایک ویگن کا بندوبست کیا ہے۔ پرسوں صبح دونوں گاڑیاں مانسہرہ سے یہاں پہنچ جائیں گی۔ پرسوں صبح انشاء اللہ مظفر آباد کے لیے روانہ ہوں گے۔"

"اور کوئی پرابلم تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تو پرابلمز کے لیے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ ایک خدمت کرنی ہے تو اس کی راہ میں جتنی بھی مشکلات آئیں گی' انشاء اللہ برداشت کریں گے۔ ویسے اللہ کا بڑا کرم ہے' سب انتظامات مکمل ہیں۔"

سر ممنون جیسے بے لوث خدمت خلق کرنے والے انسان میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ پورا نام ہے سید ممنون احمد راحت اشرفی.......... رہائش کراچی کے سیکٹر II-G-1 مکان نمبر H-100 میں ہے۔ پیشہ معلمی' نارتھ ناظم آباد کے ٹل فاکس اسکول میں پڑھاتے ہیں' اسکاؤٹ ماسٹر کی اضافی ذمے داری بھی سنبھالتے ہیں۔ شوق ہے لوگوں کے کام آنا.......... خدمت خلق۔ الجدت اسکاؤٹس اوپن گروپ ان کا اپنا قائم کردہ ہے۔ شہری دفاع ضلع وسطی کے ڈویژنل وارڈن بھی ہیں۔ علاقے میں سوشل ورک کرنے والوں میں پیش پیش ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی زندگی میں اپنے لیے فرصت کا ایک لمحہ بھی نہیں۔ پہلے کبھی اسکول کی گرمی کی چھٹیوں میں کچھ اپنے لیے وقت مل جاتا تھا انہیں۔ مگر ایک بار جو وہ کسی پارٹی کے ساتھ پاکستان کی سیاحت کر کے آئے تو اس سے بھی گئے۔ دل میں ٹھان لی کہ موسم گرما کی چھٹیوں میں ہر سال ایک پارٹی لے کر سیاحت کو جایا کریں گے۔ جب سے اب تک وہ سلسلہ چل رہا ہے۔ کتنا ذمے داری کا اور تھکا دینے والا کام ہے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسروں کو تفریح کراتے ہیں اور خود تمام وقت کسی نہ کسی پریشانی میں گرفتار رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ متوسط طبقے کا کوئی شخص اپنے طور پر اتنی طویل سیاحت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ بہت مہنگی تفریح ہے لیکن سرممنون نے اسے اتنا سستا بنا دیا ہے کہ غریبوں کے بچے بھی اس عیاشی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ پارٹی میں اسکول اور کالج کے طلباء و طالبات' گرل گائیڈز' شہری دفاع کے لوگ اور اساتذہ شامل ہوتے ہیں۔ قیام ہوٹلوں کی بجائے اسکولوں میں ہوتا ہے۔ کھانے کے لیے باورچی ساتھ ہوتا ہے اور تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ٹرانسپورٹ سستا پڑتا ہے اور درد سر جتنا بھی ہے' سرممنون کا۔

اتفاق کی برکت سے سب لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔
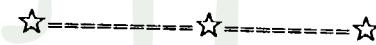
"کل کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے سرمنون سے پوچھا۔

"ایوبیہ کی سیر کو جائیں گے' چلو گے؟"

"جی نہیں۔ میں نے ایک نئی کہانی شروع کی ہے۔ جہاں جہاں موقع ملا' کام بھی کرتا رہوں گا۔ ایوبیہ میں جا چکا ہوں۔ ویسے بھی وہاں چیئرلفٹ کے سوا کیا رکھا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ کل تم سکون سے کام کرنا۔"

☆========☆========☆

اگلے روز صبح دس بجے پارٹی ایوبیہ کے لیے روانہ ہو گئی۔ ہمارے چار کمرے خالی ہوئے تو ہوٹل میں سناٹا ہو گیا۔ ویسے بھی مری میں دن کے وقت ہوٹلوں میں کون ٹھہرتا ہے۔ ہوٹل تو بس شب بسری کے لیے ہوتے ہیں۔ میں نے باہر کا ایک چکر لگایا اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ماحول بہت ہی پُرسکون تھا۔ میں نے بیرے کو چائے لانے کو کہا اور خود پوری یکسوئی سے لکھنے بیٹھ گیا۔

جانے کتنی دیر میں بیٹھا لکھتا رہا۔ بھوک کا احساس ہوا تو کھانا منگوا لیا۔ کھانے کے بعد پھر چائے پی۔

میں کام میں منہمک تھا کہ بادل بڑے زور سے گرجے۔ ساتھ ہی مجھے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی چادر اٹھا کر بدن پر ڈال لی۔ باہر جو دیکھا تو آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بجلی بھی چمک رہی تھی۔ بادلوں کی گرج سے زمین کا سینہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔

اب کمرے میں رکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مجھے تو بارش سے عشق ہے۔ کراچی جیسے شہر میں بھی' جہاں بارش رحمت کی بجائے زحمت بن جاتی ہے' مجھے بارش بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ بارش اندر کا موسم ہے.......... اندر کی سرشاری کا۔ میں نے اٹھ کر جوتے پہنے' جیکٹ پہنی' رین کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ بوندیں بہت موٹی تھیں اور کنکروں کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں رونق سے دور ایک سڑک پر ٹہلتا چلا گیا۔ سڑک کی ایک جانب گہری کھائیوں کا سلسلہ تھا۔ دور بہت دور بادلوں کی دھند میں لپٹا ایک پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ اچانک بادل

بہت زور سے گرجے۔ میری نظر کھائی کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے کچھ یاد آگیا...........

یہ ہل اسٹیشن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں پہلی بار 76ء میں مری آیا تھا۔ میرے ساتھ تین دوست اور بھی تھے۔ وہ ماہ اگست کے ابتدائی دن تھے۔ ہم کسی ہوٹل میں مناسب سے کمرے کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ ہوٹلوں کے ایجنٹ بھی سڑکوں پر پھرتے ہیں اور کوئی مسافر نظر آجائے تو کمرے کی آفر کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ایجنٹ نے ہم سے پوچھا "کمرا چاہیے باؤ جی؟" ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہمیں کچھ دور ایک ہوٹل میں لے گیا۔ چھوٹا سا........... تنگ سا ہوٹل تھا۔ ہم زینے چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچے۔ اس نے ہمیں کمرا دکھایا۔ اٹیچڈ باتھ دکھایا۔ بستر یونہی سے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کمرا بھی یونہی سا تھا۔ ہوٹل کے ایجنٹ نے محسوس کرلیا کہ کمرا ہمیں پسند نہیں آیا ہے۔ اس نے جھٹ ایک طرف اشارہ کیا۔ "بالکونی بھی ہے باؤ صاب۔" ہم نے دروازہ کھولا اور بالکونی میں قدم رکھا۔ اس کے ساتھ ہی لگا کہ دنیا بدل گئی ہے۔ چکر ہی آگئے۔ بالکونی سے نیچے دیکھا تو دیوتا کوچ کر گئے۔ پہلی منزل کی اس بالکونی سے زمین کم از کم پانچ چھ سو فٹ دور تو رہی ہوگی۔

میں نے کہا "بھائی........... یہ تو ۱۰۰ ویں منزل کی بالکونی لگ رہی ہے اور ۱۰۰ ویں منزل پر بالکونی بنانا تو بہت بڑا ظلم ہے۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ جی باؤ جی۔ یہ ہوٹل پہاڑی کے کنارے پر بنا ہے نا........... اس لیے۔"

ہمیں ڈر بھی لگ رہا تھا اور نیچے دیکھنے میں لطف بھی آرہا تھا۔ ہم نے وہ کمرا صرف اس بالکونی کی وجہ سے لے لیا۔

مجھے اب بھی یاد ہے........... اور میں کبھی بھول بھی نہیں سکتا۔ اس ہوٹل میں گزاری ہوئی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ رات نو بجے کے قریب اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسی خوفناک گرج چمک تھی کہ الاماں۔ ہم لوگ سونا بھول گئے۔ کمرے میں روشنی تھی ہی۔ ایک دوست بالکونی میں روشنی کرنے لگا تو میں نے منع کر دیا

"رہنے دو یار۔ اندھیرے میں بالکونی میں کھڑے ہو کر دیکھیں گے تو بارش کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

ہم چاروں بالکونی میں چلے گئے اور بارش کا نظارہ کرنے لگے۔ یہ نظارہ کرنے لگے تو میں نے غلط کہا ہے۔ نظارہ کرنے کو وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ پس منظر تو کجا' بارش بھی بس محسوس ہی ہو رہی تھی' نظر نہیں آرہی تھی لیکن کچھ نظر نہ آنے پر بھی لطف ایسا محسوس ہو رہا تھا' جیسے سب کچھ نظر آرہا ہو۔ بارش کی موسیقیت اپنی جگہ ایک مکمل چیز ہوتی ہے۔ خاص طور پر گردوپیش میں درخت بھی موجود ہوں تو جی چاہتا ہے کہ درختوں کے پتوں پر پانی کی ٹپ ٹپ بس سنتے ہی رہیے۔

اچانک بادل یوں گرجے جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ہم سب ایک لمحے کو دہل کر رہ گئے۔ پھر میری نظر بالکونی کے نیچے گئی۔ وہاں بے کراں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن اگلے ہی لمحے بجلی چمکی اور مجھے جو کچھ نظر آیا' اس نے مجھ پر لرزہ طاری کر دیا۔ سچ مچ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس سے پہلے میں نے بجلی کو ہمیشہ سر اٹھا کر' آسمان پر چمکتے دیکھا تھا مگر اس لمحے میں نے سر جھکا کر بجلی کو خود سے کافی نیچے کوندے کی طرح اپنے قدموں کے نیچے لپکتے دیکھا۔ میں زندگی میں اتنا خوف زدہ کبھی نہیں ہوا اور پھر بجلی اس جگہ چمکتی ہی رہی........... بے حد روشن' بے حد تیز رفتار اور ہر بار ایسا لگتا تھا کہ وہ ہوٹل کی بنیادوں کے نیچے زمین میں گھس گئی ہے اور اب کسی بھی لمحے ہوٹل اپنی بنیادوں سے اکھڑ کر سیکڑوں فٹ نیچے کھائی میں جا پڑے گا۔

میں نے دوستوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی مجھے صرف خوف نظر آیا۔ پھر ہم چاروں بغیر ایک لفظ کہے بالکونی کا دروازہ بند کر کے کمرے میں آگئے اور بستر میں دبک گئے کہ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں بستر پر لیٹا تصور میں بجلی کو اسی طرح نیچے چمکتے دیکھتا رہا پھر اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ خوف دور ہو گیا۔ میں نے تصور کیا کہ میں نیچے کھائی میں کھڑا ہوں اور سر اٹھائے ہوٹل کی بالکونی کو دیکھ رہا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے

پھر بادل گرجے ہیں اور بجلی چمکی ہے۔ وہاں سے بجلی کا وہ کوندا مجھے نارمل.......... یعنی سر اٹھا کر دیکھنے پر نظر آرہا ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ بجلی کھائی کے اوپر چمک رہی تھی اور ہوٹل کھائی سے بہت اوپر تھا۔ ہم جو کہتے ہیں' وہی سمجھتے بھی ہیں۔ یعنی آسمان پر بجلی چمک رہی ہے۔ حالانکہ بجلی بادلوں کے درمیان چمکتی ہے۔

اگلی صبح ہوٹل کے مالک نے ہمیں بتایا کہ اس ماہ میں برسوں کے بعد ایسی خوف ناک طوفانی بارش ہوئی ہے۔

اور اب میں سر جھکائے نیچے کھائی میں بجلی کو کوندے کی طرح لپکتے دیکھ رہا تھا۔ کڑکتے سن رہا تھا اور اندر سے خوش ہو رہا تھا۔

چار بجے کے قریب بارش رکی اور دھوپ نکل آئی۔ میں ہوٹل واپس آگیا۔ چھ بجے ہماری پارٹی بھی ایوبیہ سے واپس آگئی۔ سب بہت خوش نظر آرہے تھے۔

حسین بخش آتے ہی کھانا پکانے میں مصروف ہو گیا۔ سب لوگ چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں لان پر بیٹھ گئے۔ میں نے کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھا اور پھر کاغذ پر جھک گیا۔ سیکوینس مکمل کیے بغیر میں کہانی سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

باب مکمل کرنے کے بعد میں کاغذ سمیٹ کر رکھ ہی رہا تھا کہ سائرہ آگئی "کہو بھئی جاسوسہ' کیسی رہی آج کی تفریح؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک" اس نے جواب دیا پھر چند لمحے سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے کہا "یہ صائمہ عجیب لڑکی ہے۔ کبھی کبھی سمجھ سے باہر ہو جاتی ہے۔"

"کیوں' غیر معمولی بات کیا ہے اس میں؟"

"لڑکیوں میں دلچسپی نہیں لیتی۔ لڑکوں میں گھسی رہتی ہے ہر وقت" سائرہ کے لہجے میں شکایت تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ صائمہ نے اسے نظرانداز کیا ہو گا۔

"یہ تو فطری بات ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "یہ تو بتاؤ' یہ صائمہ اکیلی آئی ہے کیا؟"

"نہیں۔ تین اس کے کزن ہیں ساتھ۔ دو ان کے دوست ہیں" سائرہ نے بتایا

"اور ہاں' اپنے طاہر صاحب کو بھی ذرا باندھ کر رکھیے۔"

"کیوں۔ اسے کیا ہوا؟"

"راحیلہ میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"اوہ!" میرے منہ سے نکلا۔ میں نے یہ گزشتہ شب ریسٹورنٹ میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ اب میں سائرہ کو کیسے سمجھاتا کہ یہ پہاڑ کا' مٹھی میں بند ہو کر بھی نہ بند ہونے والی بدلی کا اور اندر کی دھنک کا جادو ہے' جو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور جانے کب تک بولے گا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "بھئی میں تو باہر چلا۔ آج اچھا خاصا کام کیا ہے میں نے۔ مگر اب کمرے میں بیٹھے بیٹھے دم گھٹنے لگا ہے۔"

سائرہ لڑکیوں والے کمرے میں چلی گئی اور میں باہر لان پر آگیا۔ ایک طرف نعیم اور طاہر بیٹھے نظر آئے۔ میں ان کی طرف چلا گیا اور گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا "کہو بھئی طاہر' کیسی رہی تفریح؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھی ظفر بھائی' میں بہت خوش ہوں" طاہر نے جواب دیا۔ ہم ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر سر ممنون نے نعیم کو کسی کام سے بلا لیا "سنا ہے' تم نے پھول کھلا لیا ہے۔" اس کے جانے کے بعد میں نے طاہر سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"بھول گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ گل کھلانا' بہت بھاری محاورہ ہے اس لیے یہاں میں اسے پھول کھلانا کہتا ہوں۔"

"پھول تو خود بخود کھل جاتے ہیں ظفر بھائی" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں فلرٹ کا قائل نہیں ہوں۔"

"گویا تمہیں محبت ہو گئی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ پارٹی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں جو.........."

"میں نے راحیلہ کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"یوں کہو کہ دھنک سے بچی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ اب بھی وہی لڑکی ہے۔"

"ظفر بھائی‘ میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "مجھے خود پر اختیار نہیں رہا ہے‘ میں اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں‘ تمہاری کیفیت سمجھتا ہوں" مجھے اس پر ترس آنے لگا "اور دوسری طرف کیا حال ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس میرا اندازہ ہے کہ وہ بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

"یہ اندازہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ گزشتہ شب ریسٹورنٹ میں۔ میں بس یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تمہیں دکھ سے محفوظ رکھے" میں نے کہا۔

اسی وقت شمس صاحب آگئے "ظفر میاں‘ آج آپ ہمارے ساتھ نہیں تھے؟" انہوں نے گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی میں کام میں مصروف تھا" میں نے جواب دیا۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔

رات کے کھانے کے بعد سر ممنون نے پارٹی کو مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ گروپ اجتماعی کاموں کے سلسلے میں‘ بس میں سیٹوں کے معاملے میں اور کھانے کے وقت کام آتے ہیں۔ ہر روز دو گروپس کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ اس میں سفر کی صورت میں بس پر سامان چڑھانا اور اتارنا‘ کھانے پینے کا سامان خرید کر لانا‘ حسین بخش کا ہاتھ بٹانا اور پانی کا بندوبست کرنا شامل ہے۔ سفر کے دوران بس کی سیٹوں پر بھی گروپ باری باری بیٹھتے ہیں۔ پہاڑی سفر میں پچھلی سیٹوں پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جنہیں الٹیاں بہت آتی ہیں اور یہ وقت ہر گروپ پر آتا ہے۔ گروپ بناتے وقت یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہے کہ ہر گروپ میں خواتین کے ساتھ لڑکے یا مرد بھی ہوں۔ ظاہر ہے‘ خواتین پانی بھی نہیں بھر سکتیں اور سامان اتارنے چڑھانے کا کام بھی نہیں کر

سکتیں۔ البتہ وہ حسین بخش کا ہاتھ ضرور بٹاتی ہیں۔

میں‘ نعیم‘ طاہر‘ سائرہ‘ راحیلہ اور مس راشدہ گروپ چار میں تھے۔ گروپ تین میں صائمہ‘ انیلا‘ مس نائلہ اور صائمہ کے تینوں کزن تھے۔ گروپ نمبر تین ہونے کی حیثیت سے انہیں ہمارے آگے والی سیٹوں پر بیٹھنا تھا۔

"اب بہتر یہ ہے کہ سب لوگ سو جائیں" سر ممنون نے اعلان کیا "گاڑیاں صبح سات بجے یہاں پہنچ جائیں گی۔ ہمیں آٹھ بجے روانہ ہو جانا چاہیے۔ دیر کریں گے تو پھر آپ لوگوں کو کھانے پینے کی تکلیف ہوگی اور ہاں‘ خشک غذا کے پیکٹ مثلاً بسکٹ اور دال سیو وغیرہ ضرور ساتھ رکھ لیجئے گا۔"

☆==========☆==========☆

لیکن روانگی پروگرام کے مطابق نہ ہو سکی۔ ہم لوگوں کو تو سر ممنون نے صبح چھ بجے اٹھا دیا تھا لیکن خواتین پر ان کا زور نہ چل سکا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے نو بج گئے۔ دس بجے کے قریب گاڑیاں روانہ ہوئیں۔

وہ آغاز سفر تھا لہٰذا گروپ نمبر ایک سب سے آگے والی سیٹوں پر تھا۔ ہمیں درمیان کی سیٹیں ملی تھیں۔ ڈرائیور کے عین پیچھے والی تین کی سیٹ اور دروازے کے ساتھ والی اگلی سیٹ ہمیشہ منتظم گروپ کی ہوتی تھی۔ سر ممنون اس گروپ کے لیڈر تھے۔ ہمارے آگے وہ گروپ تھا‘ جس میں صائمہ شامل تھی۔ تب میں نے پہلی بار اس کے کزنز کو دیکھا۔ وہ سب عمر میں اس سے کافی چھوٹے تھے لیکن وہ بچوں میں بچی بنی ہوئی تھی۔

"تو یہ وہ لڑکے ہیں‘ جن کے بارے میں تم کہہ رہی تھیں؟" میں نے سرگوشی میں سائرہ سے پوچھا۔

"کون سے لڑکے؟"

"تم کہہ رہی تھیں ناکہ صائمہ کو لڑکوں کے ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں‘ یہ وہی لڑکے ہیں؟"

"جی ہاں" سائرہ نے کہا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "کیا بات ہے‘ اس

کی وکالت کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میرا خیال ہے' اسے وکیل کی ضرورت ہی نہیں" میں نے جواب دیا۔

اپنی لائن میں تین والی سیٹ پر میں' طاہر اور نعیم بیٹھ گئے تھے۔ دو والی سیٹ پر سائرہ' راحیلہ اور مس راشدہ بیٹھی تھیں۔ صائمہ اپنے دو کزنز کے ساتھ ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گروپ چھ میں دو زندہ دل دوست تھے' زاہد اور عمران۔ وہ سیٹوں پر بیٹھنے کی بجائے پچھلے دروازے پر کھڑے سفر کو انجوائے کر رہے تھے۔

بس میں خاموش تھی۔ سب متجسس نگاہوں سے کھڑکیوں سے باہر کے منظر دیکھ رہے تھے جن کی خوب صورتی ناقابل یقین تھی پھر ڈرائیور نے کیسٹ لگا دیا۔ اور بس میں گانے کی آواز گونجنے لگی۔ سہانا سفر اور یہ موسم حسیں' ہمیں ڈر ہے ہم کھو نہ جائیں کہیں' گانا سفر کی مناسبت سے وجد طاری کر دینے والا تھا۔ بس کا سکوت اور گہرا ہو گیا۔

اچانک اس سکوت کو ایک نسوانی قہقہے نے تار تار کر دیا۔ آواز عقب سے آئی تھی اور وہ محض اشارت تھا۔ اس کے بعد باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ لفظ تو سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اتنا پتا چل رہا تھا کہ پیچھے کی سیٹوں والے ایک دوسرے پر چھینٹے بازی کر رہے ہیں پھر ان میں مردانہ آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ آوازیں پچھلے دروازے پر کھڑے زاہد اور عمران کی تھیں۔

طاہر بڑے انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ آوازوں نے اس کے انہماک کو توڑا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور خاصی دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے سر گھمایا اور مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

"کیوں.......... کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ رحم فرمائے۔ آپ کی پہلی پیش گوئی تو درست ثابت ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ جو پیچھے سے آواز آ رہی ہے' یہ صرف اور صرف محترمہ نغمہ کی ہے" اس نے جواب دیا "آپ نے کہا تھا کہ شاید ہم سب سے پہلے اسے بدلتے دیکھیں گے۔ وہ زاہد اور

عمران سے باقاعدہ جملے بازی کر رہی ہے۔"

"ابھی بدتمیزی بھی کرے گی" میں نے کہا "ہیں کواکب کچھ' نظر آتے ہیں کچھ۔ چھوڑو' تم اپنا نقصان کیوں کرتے ہو' اپنے اندر کی دنیا کو بس سے باہر کی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرو۔ بس کے اندر کی دنیا کو بھول جاؤ۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ!" طاہر نے کہا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔

میں اپنی سوچوں میں ڈوب گیا۔ میرا یہ چھٹا سفر تھا۔ ان مناظر کا کمال یہ تھا کہ جتنی بار بھی دیکھو' نئے ہی لگتے ہیں لیکن اس بار میں ایک ذہنی خلفشار سے دو چار تھا۔ یہ تو ایک فطری بات ہے کہ مناظر دیکھ کر پرانی یادیں آتی ہیں مگر اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ایسے خوب صورت سفر میں خوش گوار یادیں زیادہ ہوتی ہیں.......... اور جو ناخوش گوار یادیں ہوتی ہیں وہ غیر اہم لگتی ہیں اور محو ہو جاتی ہیں۔ مگر اس بار معاملہ مختلف تھا۔ پچھلے سال میں اسی لیے ٹوور پر نہیں آیا تھا کہ مجھے کوئی یاد آئے گا۔ دل کے زخم سے ٹیسیں اٹھیں گی اور میں نے مصروفیت کے زور پر جن یادوں کو دبا رکھا ہے' وہ ابھر آئیں گی۔ اب اس سال سائرہ اور نعیم نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں چلا تو آیا تھا لیکن خائف تھا کہ شبنم کی یادیں آسیب بن کر ہر مقام پر میرا پیچھا کریں گی۔ شبنم' جس نے دو سال پہلے میرے ساتھ سفر کیا تھا' جس نے دھنک سے سجی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پسند کیا تھا' جو دھنک کے رنگ تحلیل ہوتے ہی مجھ سے کھنچ گئی تھی.......... اور میں اب تک تمام جتن کرنے کے باوجود اسے پوری طرح بھلا نہیں سکا تھا۔

میں باہر دیکھنے سے گریز کر رہا تھا کہ شبنم کی یادوں سے بچنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں زیر تحریر کہانی کے پلاٹ سے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں اپنے ذہن کو پوری طرح اس پر مرکوز نہیں کر رہا تھا مگر کم از کم شبنم کے خیال سے محفوظ تھا۔

محمد رفیع کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "تم جو مل گئے ہو تو یہ لگتا ہے کہ جہاں مل گیا۔" اس گانے نے میرے اندر کے تمام حفاظتی بند توڑ دیے۔ اس گانے کو تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی گانا تو تھا' جس نے دو سال پہلے مجھے پہلی بار شبنم کی موجودگی کا

احساس دلایا تھا اور میں نے اس میں کشش محسوس کی تھی۔

میں وہیں بیٹھے بیٹھے زمان و مکاں کے فاصلے پھلانگ کر کہیں اور پہنچ گیا۔

☆------------☆------------

میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا باہر خواب خواب فضا کو دیکھ رہا تھا۔ بس ذرا دیر پہلے نتھیا گلی سے چلی تھی، جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اب ہم ایبٹ آباد جا رہے تھے۔

پہاڑی سفر ہوتا ہی خطرناک ہے۔ راستے خطرناک ہوتے ہیں۔ سلائیڈنگ معمولی بات ہے اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ کسی بھی وقت کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کہیں خوف زدہ ہو جاؤں لیکن مری سے ایبٹ آباد کا سفر براستہ نتھیا گلی مجھے ہمیشہ خطرناک لگتا ہے۔ مگر اس سفر کا اپنا ایک حسن بھی ہے، جس کے سحر سے آدمی نہیں بچ سکتا۔ جون جولائی میں وہاں آوارہ بادل بڑی بے تکلفی سے سڑک پر مٹرگشت کرتے ہیں۔ جب زیادہ ہو جائیں تو دھند کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے میں کوئی چیز حقیقی نہیں لگتی۔ سبھی کچھ خواب خواب لگنے لگتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑ پر استادہ چیڑ اور صنوبر کے بلند و بالا درخت، جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ کوئی فوج پہاڑ کی چوٹی کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ دوسری طرف ایسی گہری کھائیاں کہ دیکھ کر چکر آجائیں۔ معلوم نہیں، درحقیقت ایسا ہے یا مجھے لگتا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اتنی گہری کھائیاں میں نے کہیں اور نہیں دیکھیں۔ اسی لیے میں اس سفر کو خطرناک ترین سمجھتا ہوں لیکن جب دھند ہوتی ہے اور ہر حقیقت خواب میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے، تب وہی کھائیاں بہت حسین لگتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی کیفیت تھی۔ میں خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

ڈرائیور نے ایک کیسٹ لگایا ہوا تھا۔ اچانک رفیع کا گانا شروع ہوا...... "تم جو مل گئے ہو تو یہ لگتا ہے کہ جہاں مل گیا۔" میں چونکا۔ میں نے سر گھمایا۔ اسی لمحے میری نظر آگے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شبنم پر پڑی...... لیکن نہیں، شبنم پر نہیں، اس کی ایک آنکھ پر۔ وہ بھی باہر دیکھ رہی تھی۔

میری نظر جم کر رہ گئی۔

میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ لفظوں سے کھیلنا میرا کام ہے لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس دید کے بیان کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کبھی ایسی ہی صورت حال آپ کو پیش آئے تو خود دیکھ بھی لیجئے گا اور محسوس بھی کر لیجئے گا۔ پہلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ صرف باہر نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ دزدیدہ نگاہ سے مجھے بھی تک رہی ہے مگر دوسرے ہی لمحے سب کچھ بدل گیا۔ اس ایک نظر کا تاثر ہی تبدیل ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ تو باہر ہی دیکھ رہی تھی پھر بھی اس کی آنکھ مجھے نظر آ رہی تھی۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ وہ کیسی کٹورا آنکھیں ہوں گی اور ان کی رنگت...... شربت روح افزا میں برابر کا شہد ملا دیکھیں۔ شاید یہ محلول ان شفاف شربتی آنکھوں کے حسن کے قریب پہنچ جائے اور ان کی گہرائی...... روح افزا اور شہد کے محلول کی جھیل کی تہ میں سمجھ لیں، چھوٹا سا بھورا تل پڑا تھا۔

ایسی آنکھوں میں ڈوبنے سے کوئی بچ سکتا ہے!

میں ہر منظر بھول کر ان گہری شربتی آنکھوں میں ڈوب گیا۔ مجھے ہوش ہی نہیں رہا۔ پہلی نظر کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کبھی ایک لمحے کو اس کی وہ آنکھ میری جانب نگراں ہوتی تو میں گڑبڑا کر باہر دیکھنے لگتا۔ باقی سفر اسی آنکھ مچولی میں کٹا۔ شام کے قریب ہم ایبٹ آباد پہنچ گئے...... ایبٹ آباد، خوب صورت شہر عساکر!

ایبٹ آباد میں ہم گورنمنٹ اسکول نمبر ۳ میں ٹھہرے تھے۔ خوب صورت اور بڑا اسکول ہے۔ وہاں ہماری آمد کی پہلے سے اطلاع تھی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے اوپری منزل پر پانچ کمرے کھلوا دیئے...... ایک پارٹی کی انتظامیہ کے لئے، دو مردوں کے لیے اور دو خواتین کے لیے۔ اسکول کی ان دنوں گرمی کی چھٹیاں تھیں۔

ایبٹ آباد سے مجھے پہلی ہی نظر میں محبت ہوئی تھی۔ شاید اس کا سبب موسم تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ میں پہلی بار ایبٹ آباد آیا، تب بھی پارٹی اسی اسکول میں ٹھہری

تھی۔ ہم پہنچے تو گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگی۔ میں بارش میں بھیگتا میدان میں کھڑا سامنے سربن کے پہاڑ کو دیکھتا رہا' جس کے سینے پر بہت بڑے حروف میں لبیک.......... اور انگریزی میں ہوم آف پیفرز لکھا نظر آرہا تھا (پیفرز بلوچ رجمنٹ کو کہتے ہیں) مجھے اسی لمحے افواج پاکستان کے اس خوب صورت شہر سے عشق ہو گیا تھا۔

سامان اترنے کے مرحلے سے نمٹتے ہی میں اور نعیم کسی ہوٹل میں کمرے کے حصول کے لیے نکلے۔ ہر سال ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہوٹل میں کمرا لینے کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو مجھے سکون سے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ دوسرے اسکول میں ٹوائلٹ کا انتظام تو ہوتا ہے لیکن باتھ روم کا بندوبست نہیں ہوتا۔ لڑکے اور ٹیچر وغیرہ تو حمام میں نہا لیتے ہیں لیکن خواتین کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایسے میں ہوٹل کے کمرے کا باتھ روم ان کے لیے مشکل کشا ثابت ہوتا ہے۔ ٹوائلٹ کے لیے بھی صبح لائن لگی ہوتی ہے۔ ایسے میں بھی کمرے کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

جناح روڈ پر سربن ہوٹل میں ہم نے ایک کمرا لے لیا۔ نعیم' بیگ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اتنی دیر میں' میں نے نہا دھو کر کپڑے بدل لئے "اب تم نہالو" میں نے نعیم سے کہا "پھر چائے پئیں گے۔"

نعیم باتھ روم سے نکلا تو چائے آچکی تھی۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ نعیم کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن ہچکچا رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھا۔ عمر کے فرق کے باوجود ہم ایک دوسرے سے ہر طرح کی بات کر لیتے تھے۔

"کیا بات ہے نعیم؟" میں نے اس سے کہا "کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ ڈالو۔"

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے کہا "برا تو نہیں مانیں گے بھائی جان؟"

"ایسی کیا بات ہے' تم کہو۔"

"پہلی بار میں آپ کو سفر کے دوران کسی میں دلچسپی لیتے دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ.......... تو تم نے دیکھ لیا" میں نے خجل ہو کر کہا۔ میں درحقیقت بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور تبدیلی بالکل اچانک آئی تھی اس لیے بے حد نمایاں تھی۔"

"ہاں۔ بس سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔"

"کچھ جانتے بھی ہیں اس کے بارے میں؟"

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"خیر.......... اس کی فکر نہ کریں۔ میں معلوم کرلوں گا' ویسے پیاری لڑکی ہے۔"

میں نے تصور میں اس شربتی آنکھ کو دیکھا۔ لڑکی کو میں نے دیکھا ہی کہاں تھا کہ تائید یا تردید کرتا لیکن وہ گہری شربتی آنکھ یقین دلاتی تھی کہ وہ بلاشبہ پیاری لڑکی ہوگی۔

نعیم نے چائے کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی۔ میں پہلے ہی چائے نمٹا چکا تھا

"آیئے.......... اب اسکول کی طرف چلیں۔" نعیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم ہوٹل کا کمرا لاک کر کے باہر آگئے۔ چابی میں نے جیب میں ہی رکھ لی تھی تاکہ بوقت ضرورت کسی کو دی جا سکے۔

ہم اسکول پہنچے' جہاں میدان میں حسین بخش کھانا پکانے کی تیاریاں کر رہا تھا "کہو حسین بخش' کیا پکار رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

جواب ملا "آلو انڈے۔"

میں نے نعیم کی طرف دیکھا "لو بھئی' پہلا راؤنڈ توقع سے پہلے ہی ہوگا۔"

"لگتا تو یہی ہے" نعیم نے تائید کی۔

میں نے حسین بخش سے پوچھا "گوشت نہیں ملا؟"

"نہیں بابو صاب۔ مرغی بھی نہیں ملی۔"

ہم اوپری منزل کی طرف چل دیئے۔ وہاں بلب جلائے جا چکے تھے۔ راہداری میں جو کچھ ڈیسک بے ترتیب پڑے تھے' انہیں سلیقے سے لگا کر لڑکوں کی ایک ٹیم تاش کھیلنے

میں مصروف ہو چکی تھی۔ پہلے مردانہ کمرے میں انیس اور شمس صاحب شطرنج کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ انتظامیہ کا کمرا بالکل آخر میں تھا.......... خواتین کے کمرے کے برابر۔ ہم اسی طرف جا رہے تھے کہ اچانک برابر والے کمرے سے وہ نکل آئی۔

وہ خالص فلمی سین تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ہماری نظریں ملیں۔ وہ ٹھٹکی اور میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں اسے روبرو دیکھ رہا تھا.......... مگر اب بھی کہاں دیکھ رہا تھا۔ میں تو ان گہری شربتی آنکھوں میں کھو گیا تھا۔ دیکھا تو اسے پہلے بھی تھا لیکن یوں نہ دیکھا تھا۔

اگر اس وقت کوئی راہداری میں نکل آتا تو کم از کم مجھے بہت خفت ہوتی۔ میں اور وہ بت بنے کھڑے تھے۔ نعیم نے صورت حال کو سنبھالا "کہاں کا ارادہ ہے مس شبنم؟"

وہ چونکی.......... اور ساتھ ہی اس لمحے کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ "میدان میں نل لگا ہے نا؟" وہ بولی "میں منہ دھونے جا رہی ہوں۔"

"آپ نہا کر تازہ دم کیوں نہیں ہو جاتیں!" نعیم نے کہا۔

اس نے حیرت سے نعیم کو دیکھا "مگر یہاں باتھ روم تو ہے ہی نہیں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں" نعیم نے کہا "آپ یوں کریں کہ بس اپنے کپڑے لے لیں اور میری بہن سائرہ سے کہیں کہ وہ بھی آجائے۔ کہئے گا میں اسے بلا رہا ہوں۔"

"مگر.........."

"اگر مگر نہیں۔ آپ کو فرسٹ کلاس شاور ملے گا" نعیم نے اس کی بات کاٹ دی "بس آپ سائرہ کو.........."

اسی لمحے سائرہ خود دروازے پر آگئی۔ نعیم نے اس سے کہا۔ "چلو.......... ہم نے کمرا لے لیا ہے۔ میں تم لوگوں کو پہنچا آؤں گا اطمینان سے نہا لینا۔"

"لوگوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟" سائرہ نے پوچھا۔

"یہ شبنم بھی چلیں گی" نعیم نے کہا اور شبنم خفیف سی ہو گئی۔ سائرہ کا لہجہ ہی ایسا تھا۔

"ہاں ٹھیک تو ہے۔ چلو شبنم، کپڑے لے لو اپنے" سائرہ نے شبنم سے کہا۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ شبنم اب پُراعتماد لگ رہی تھی۔

"جائیں نا.........." نعیم نے اس سے کہا۔

"وہ.......... میں.......... میرے ساتھ میری ایک کزن بھی ہے" شبنم کے لہجے میں التجا تھی "اسے بھی لے لوں ساتھ؟"

"اجازت ہے۔" نعیم نے شاہانہ انداز میں کہا۔

شبنم نے ایک لمحے میری آنکھوں میں دیکھا، پھر پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ شربتی آنکھیں صرف خوب صورت نہیں ہیں، لفظوں کے بغیر بولتی بھی ہیں۔ اس لمحے ان آنکھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اپنا.......... بہت اپنا سمجھتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ یہ میری خوش فہمی نہیں ہے۔

میں سحر زدہ سا وہیں کھڑا تھا۔ نعیم نے مجھے چونکا دیا "کس سوچ میں پڑ گئے بھائی جان؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا اور جیب سے کمرے کی چابی نکال کر اسے دے دی۔

"کیوں.......... آپ نہیں چلیں گے؟"

"نہیں، یہ مناسب نہیں" میں نے کہا اور سرمنون کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق رات کے کھانے پر بدمزگی ہوئی بہت سے لوگ آلو انڈے پر ناک بھوں چڑھاتے نظر آئے۔ شبنم کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک خوب صورت لڑکی اس سلسلے میں پیش پیش تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شبنم کی کزن افشاں ہے۔ اس نے ہی اور لوگوں کو بھی بھڑکایا "یہ کوئی کھانا ہے" وہ غرائی "فٹ فار دی اینی ملز۔"

اس کے بعد مزید آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ ایسے کئی مرحلے ہر ٹوور پر ہوتے تھے۔ مجھے تو ان کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ بھی تھا کہ میں سمجھاتا تو بیشتر افراد قائل ہو جاتے تھے مگر دو چار شاکی طبیعت والے تو ہر پارٹی میں ہوتے تھے اور اس مزاج کے لوگوں کو کوئی

بھی مطمئن نہیں کر سکتا۔

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک لڑکے نے بھنا کر افشاں سے کہا "کھانے کے لیے اتنے خراب الفاظ استعمال کئے ہیں آپ نے۔ اب آپ پلیز یہاں سے اٹھ جائیں اور ہم جانوروں کو کھانا کھانے دیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے اب کھانا کھانے کا۔"

افشاں کو احساس ہو گیا کہ اس نے بہت سخت بات کہی ہے۔

"نہیں.......... میں سچ کہہ رہی ہوں" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا "گھر میں ایسا کھانا کھانے کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر گھر میں ہی رہی ہوتیں" اس لڑکے نے جواب دیا۔ "یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"بھئی، آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ جلتے ہیں" ایک لڑکی نے مداخلت کی "افشاں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے تو اس میں اس کا کیا قصور۔"

"اور کیا" ایک اور لڑکے نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہم لوگوں کا تعلق ہنستے کھیلتے گھرانوں سے ہے تو یہ ہماری قسمت۔"

اس پر قہقہہ لگا۔ افشاں کھسیا گئی۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی شبنم اس گفتگو سے بے نیاز کھانے میں مصروف تھی۔ صرف ایک بار اس نے نظریں اٹھائیں تو اندازہ ہوا کہ وہ افشاں کے رویے پر شرم ساری محسوس کر رہی ہے۔

"اگر آپ لوگ برا نہ مانیں تو میں آپ سب سے کچھ کہنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

اس پر بہت سی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ شمس صاحب نے کہا "کہئے ظفر میاں۔"

"میں یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہم وطن عزیز کی خوب صورتی دیکھنے نکلے ہیں" میں نے بے حد رسان سے کہا "اور یقین کریں کہ ہم اجتماعی طور پر سفر کرنے کے بجائے انفرادی طور پر یہ سفر کرتے تو یہ بیس ہزار روپے میں بھی ممکن نہ ہوتا۔ یہ سب اتفاق کی برکت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ دوسری بات یہ ہے

کہ ہمیں سب سے پہلے اپنی ترجیحات کا تعین کر لینا چاہیے تھا.......... آغاز سفر سے بھی پہلے۔ اگر ہم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جن کی اولین ترجیح گھر کا سا کھانا اور گھر کا سا آرام ہے تو اب ہر روز ان کی مایوسی میں اضافہ ہی ہوگا۔ جن لوگوں کی پہلی ترجیح پاکستان کی خوب صورتی کو دیکھنا اور سراہنا ہے، وہ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو۔یقیناً کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ دیکھیں، زندگی کا اصول ہے کہ ہر اچھی اور پسندیدہ چیز کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے..........

"اب یہ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نکتہ نظر ہے کہ کس کے نزدیک وہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں، جن سے ہمیں آگے گزرنا ہوگا، اس خوب صورتی کی سستی قیمت ہیں یا مہنگی؟"

میں نے کچھ توقف کیا.......... یہ دیکھنے کے لیے کہ میری بات کا کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔ وہ گہری شربتی آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ ان میں حیرت بھی تھی، ستائش بھی اور ایک موہوم سا وعدہ بھی۔

انیس صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا "تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے ظفر میاں! لیکن جن کی سوچ کی اڑان ہی تین وقت کے کھانے اور آرام و آسائش تک ہے، ان کے لیے تو یہ بہت ہی مہنگا سودا ہے۔"

"میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم حالت سفر میں ہیں اور سفر پُر آسائش کام نہیں ہوتا۔ ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے سفر کے دوران نماز اور روزے کے معاملے میں رعایت نہ دی ہوتی۔ لہٰذا سفر کے دوران لگژری کی خواہش حماقت ہی ہوگی۔ میرا خیال ہے، کم از کم میں اس سے زیادہ سلیس انداز میں یہ بات نہیں سمجھا سکتا۔ یہ سمع خراشی بھی میں نے اس لیے کی ہے کہ میری خواہش ہے، آپ اس سفر کو پوری طرح انجوائے کریں۔ دیکھیں کہ اللہ نے آپ کو کیسا حسین اور پیارا وطن دیا ہے اور یہ بھی دیکھیں کہ آپ کے ہم وطن کیسی زندگی گزارتے ہیں۔ کیسی دشوار اور محرومیوں سے عبارت زندگی گزارنے کے باوجود وہ کس قدر قانع، خوش اور متواضع

ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں" یہ شبنم کی آواز تھی۔

بات ختم ہو گئی لیکن میں جانتا تھا کہ آگے جا کر اور شکایات بھی اٹھیں گی۔ نا سمجھ لوگ ہر پارٹی میں ہوتے ہیں۔

رات کو میں اور نعیم سونے کے لیے ہوٹل چلے آئے۔ نعیم بجھا بجھا نظر آرہا تھا۔ ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ ہم سونے کے لیے لیٹ گئے کہ اچانک نعیم نے مجھے پکارا "بھائی جان.......... سو گئے کیا؟"

"نہیں' کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ درحقیقت اس کی مداخلت مجھے بری لگی تھی کیونکہ میں تصور میں شبنم کو دیکھ رہا تھا۔

"بڑی گڑبڑ کی بات ہے۔ بھائی جان اور ایک بھی نہیں' دو گڑبڑیں۔"

"ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ گے بھی؟" میں جھنجلا گیا۔

"ایک تو ان کی منگنی ہو چکی ہے اور دوسرے ان کا مسلک مختلف ہے۔"

پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

☆------------☆------------☆

میں بری طرح چونکا۔ کوئی کندھے سے پکڑ کر مجھے ہلا رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا' وہ طاہر تھا "کہاں کھوئے ہوئے ہیں ظفر بھائی!" اس نے کہا "چلیں' نیچے چل کر دیکھیں تو سہی۔ لگتا ہے کوئی لمبی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

مجھے ماضی سے حال میں آنے میں کچھ دیر لگی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ بس رکی ہوئی ہے۔ بس کے آگے اچھا خاصا مجمع لگا تھا۔ ان میں مجھے سرمنون بھی نظر آئے۔ ہماری بس میں سے اچھے خاصے لوگ اتر چکے تھے.......... خاص طور پر لڑکے۔ جو رہ گئے تھے' وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟

طاہر اٹھ کھڑا ہوا "چلئے.......... چل کر دیکھتے ہیں۔"

میں بھی کھڑا ہو گیا۔ نعیم پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ ہم نیچے اترے اور مجمعے کی طرف

گئے۔

وہ منظر خوف طاری کر دینے والا تھا۔ کوئی ایک کلومیٹر تک سڑک نیچے گری ہوئی تھی.......... کھمبوں سمیت۔ میں نے گھبرا کر گری ہوئی سڑک کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ نیچے دریا تھا جس میں پانی کم تھا اور اس کا پورا پاٹ بھرا ہوا نہیں تھا۔ سڑک دریا کے خشک پاٹ پر گری تھی۔ بجلی کے کھمبے اب بھی مرحوم سڑک سے وابستہ تھے اور چاروں خانے چت پڑے نظر آرہے تھے' جیسے ایفائے عہد وفا کی کہانی سنا رہے ہوں اور یہ سب کچھ کم از کم پچاس فٹ نیچے تھا۔

ذرا تصور کریں۔ سڑک کھمبوں سمیت پچاس فٹ نیچے دھنستی چلی گئی تھی۔ مجھے کبھی کسی نے بتایا تھا کہ اس طرف کے پہاڑ کچی مٹی کے ہیں۔ بارشیں اور دریا کا پانی آہستہ آہستہ انہیں کاٹتا رہتا ہے پھر اچانک ہی سلائیڈنگ ہو جاتی ہے..........

اسی لمحے سرمنون ہماری طرف چلے آئے "خدا کا شکر ہے اس وقت سڑک پر کوئی گاڑی نہیں تھی" انہوں نے کہا "اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔"

بات واقعی غیر معمولی تھی۔ بجلی کے بعض کھمبوں کو دیکھ کر جو ٹیڑھے ہو گئے تھے' اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر دھنستے وقت سڑک پر کوئی گاڑی ہوتی تو اس کا کیا حشر ہوتا؟

نیچے ہماری پارٹی کے کچھ لڑکے اور کچھ دوسرے مسافر ٹہلتے نظر آئے۔ جگہ ایسی تھی کہ نیچے اترا جا سکتا تھا۔ طاہر اور نعیم بھی نیچے اتر گئے۔ اسی وقت صائمہ اپنے ایک کزن کے ساتھ اس طرف چلی آئی۔ اس نے نیچے گری ہوئی سڑک کو بڑی بے یقینی سے دیکھا' جیسے وہ کوئی حقیقت نہ ہو پھر اس نے بے ساختہ کہا "ہاؤ ایکسائٹنگ۔"

"یہ اس سے زیادہ ایکسائٹنگ بھی ہو سکتا تھا" سرمنون نے سرد لہجے میں کہا "اگر اس وقت ہماری بس سڑک کے اس حصے پر ہوتی تو ایکسائٹ مینٹ کی حد ہی ہو جاتی۔"

صائمہ گڑبڑا گئی "میرا یہ مطلب نہیں تھا سر" اس کے لہجے میں معذرت تھی۔

"اور یہ ایکسائٹ مینٹ جاریہ ہے۔ نہ جانے کہاں تک ساتھ چلے گا" سرمنون نے مزید کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ دیکھ رہی ہو۔ دونوں طرف ٹریفک بلاک ہے اور دور دور تک ہو گا۔ اس میں بھاری ٹرک بھی ہیں اور یہ پہاڑی سڑک ہے۔ اس پر گاڑیوں کو بیک کرنا کوئی آسان کام نہیں اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی۔"

"تو کیا اب ہم واپس............؟"

"دیکھتے ہیں۔ بظاہر تو کوئی اور صورت نہیں" سرمنون نے جواب دیا "مسئلہ یہ ہے کہ ہماری آج آمد کی اطلاع مظفر آباد کے اسکول کو ہے۔ اب یہاں سے ہم واپس جائیں گے تو مری پھر پنڈی' وہاں سے ایبٹ آباد اور پھر مظفر آباد۔ یہ کم از کم چھ گھنٹے کا سفر ہے اور یہاں سے پلٹنے میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے؟"

مسئلہ واقعی سنگین تھا۔ صائمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "مسئلہ ہوتا ہے تو اس کا کوئی حل بھی ہوتا ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر مطمئن نظر آنے لگی۔

"سر......... ہم نیچے جا سکتی ہیں؟" اس نے سرمنون سے پوچھا۔

"چلی جاؤ لیکن میری وسل کی آواز سنتے ہی آجانا" سرمنون نے کہا۔

"آؤ ندیم" صائمہ نے اپنے کزن سے کہا۔ دونوں سنبھل کر قدم اٹھاتے نیچے اترنے لگے۔

سرمنون برابر کھڑے مالک صاحب کی طرف مڑے "مالک صاحب' آپ پلیز پیچھے جا کر دیکھیں کہ کتنی گاڑیاں ہیں اور ڈرائیوروں کو بتائیں کہ انہیں ہر حال میں واپس جانا ہے' لہٰذا گاڑیوں کو موڑنے کی فکر کریں۔ میں سڑک کے اس طرف کا جائزہ لیتا ہوں ممکن ہے' کوئی سبیل نکل آئے۔"

ان موقعوں پر مجھے سرمنون پر حیرت ہوتی ہے۔ سفر کے دوران بڑی بڑی ناگہانی مصیبت میں بھی وہ پُرسکون ہو کر سوچتے ہیں اور پُرامید رہتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ کسی نہ کسی طرح پریشانی دور ہو ہی جاتی ہے۔ ان کی ذمے داری کم تو نہیں۔ ساٹھ ستر افراد کی

ذمے داری اور پھر سفر' جس میں آپ خواہ ضرورت کی تمام چیزیں کیوں نہ لے کر چلیں' وقت پڑنے پر بے سروسامانی کا احساس ستاتا ہے۔ سفر تو نام ہی بے سروسامانی کا ہے۔ کبھی میں نے خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا تو سچ یہ ہے کہ مجھے چکر آگئے۔

سرمنون دوسری طرف جانے کے لیے اترنے لگے۔ میں مالک صاحب کے ساتھ پلٹ آیا۔ مالک صاحب آگے بڑھتے گئے۔ میں اپنی بس کے پاس رک گیا۔ بس کے پیچھے اب حد نظر تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

بس میں ایک اور ہی ہنگامہ ہو رہا تھا۔ خاموش طبع' نغمہ اور زاہد کے درمیان جملے بازی تو آغاز سفر سے ہی شروع ہو گئی تھی مگر اب وہ باقاعدہ لڑ رہے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی میرے کانوں میں جو پہلا جملہ پڑا' وہ نغمہ کا تھا۔ وہ زاہد سے کہہ رہی تھی "نئی کراچی کے لفنگے۔"

اس پر زاہد نے ترکی بہ ترکی کہا "گلشن اقبال کی بھنگن۔"

مجھے دیکھ کر میرے لحاظ میں دونوں چپ ہو گئے۔ سائرہ نے کھڑکی میں سے سر نکالتے ہوئے کہا "کیا ہوا بھائی جان؟"

میں نے اسے تفصیل بتائی۔ اس کے بعد بس میں کوئی بھی نہیں رکا۔ سب نیچے اتر آئے۔ بیشتر لوگ گری ہوئی سڑک کی طرف چل دیے۔ وہاں اب تک بہت بڑا مجمع لگ چکا تھا۔ کچھ لڑکے رفع حاجت کے لیے جگہ ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئے۔

سائرہ اور راحیلہ ساتھ تھیں۔ راحیلہ نے مجھ سے پوچھا "نعیم بھائی کہاں ہیں؟ نظر نہیں آرہے ہیں؟"

میں خوب سمجھتا تھا کہ وہ کسے پوچھ رہی ہے۔ میں نے کہا "نعیم اور طاہر نیچے گری ہوئی سڑک کا معائنہ کر رہے ہیں۔ تم لوگ بھی چلی جاؤ۔"

ان کے جانے کے بعد میں بھی اسی طرف چل دیا' جدھر مالک صاحب گئے تھے۔ صورت حال میرے اندازے سے بھی خراب ثابت ہوئی۔ میں کئی موڑوں سے گزر چکا تھا لیکن رکی ہوئی گاڑیوں کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا اور سبھی گاڑیاں اپنے آگے والی

گاڑیوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ درمیان میں فاصلہ تھا ہی نہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک کلو میٹر سے زیادہ سڑک پر گاڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ اگر آپ پہاڑی سڑکوں سے واقف ہیں تو اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھتے ہیں۔ سڑک کی چوڑائی اتنی تھی کہ بمشکل دو گاڑیاں گزر سکتی ہیں اس لیے کھائی کی جانب والی گاڑیوں کو ہارن دینا پڑتا ہے۔ تب پہاڑ کی سائڈ والی گاڑیاں پہاڑ کی سمت جھک کر دوسری گاڑی کو گزرنے کی جگہ دیتی ہیں۔ اتنی پتلی سڑک پر ایک جانب پہاڑی دیوار اور دوسری جانب کھائی۔ گاڑیوں کو واپس موڑنا ایک دشوار اور وقت طلب کام تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ گاڑی سے گاڑی چپکی ہوئی تھی۔ گاڑی موڑنے کی جگہ ملنا کار محال تھا۔ پہلے موقع پیچھے والی گاڑیوں کو ملتا۔ بدقسمتی سے ہماری گاری سب سے آگے تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ بھاری سامان سے لدے ہوئے ٹرک تھے۔

بالآخر مجھے مالک صاحب نظر آگئے۔ ان کے چہرے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا "وہیں چلنا پڑے گا' جہاں سڑک گری ہے۔ میں نے جس ڈرائیور سے بھی بات کی' وہ اسی طرف دوڑ گیا۔"

"یہ یقین کرنے کے لیے کہ واقعی آگے جانے کی کوئی صورت نہیں ہے" میں نے کہا۔

"ہاں......... اپنا سفر لمبا کرنا کون پسند کرتا ہے؟" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

"مگر یوں تو یہ قطار بڑھتی ہی جائے گی" میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا "اس سڑک پر تو ٹریفک کا تانتا بندھا رہتا ہے۔"

"شکر ہے' اس کی روک تھام میں نے کر لی ہے۔ دو تین ڈرائیوروں کو میں نے سمجھا بجھا کر رضامند کر لیا ہے۔ وہ اور پیچھے جا کر گاڑیوں کو روک رہے ہیں اور انہیں پلٹنے کا کہہ رہے ہیں۔"

"تو پھر واپس چلیں؟"

ہم واپس چل دیئے۔ ہماری بس میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ سبھی نیچے پہنچے ہوئے

تھے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں دریا کے پانی سے منہ ہاتھ دھو رہے تھے کیونکہ گرمی بہت تھی۔

مالک صاحب اوپر موجود ڈرائیوروں کو گاڑی موڑنے پر قائل کرنے لگے۔ میں نیچے اتر گیا۔ دریا کا ٹھنڈا پانی بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں دھوئے اور منہ پر چھپکے مارے۔ راحیلہ اور طاہر ایک طرف ٹہلتے نظر آئے۔ پارٹی کے باقی لوگ بھی کسی نہ کسی سرگرمی میں مصروف تھے۔ انہیں ابھی صورت حال کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تو انہیں الٹا پکنک کا سا لطف آ رہا تھا۔ میں سائرہ اور نعیم کے پاس چلا گیا' جو پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔

وقت چیونٹی کی سی رفتار سے گزر رہا تھا۔ میں مرجانے کی حد تک بیزار ہو چکا تھا۔ وہ لوگ بہت بہتر تھے' جنہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ وہ پکنک مناتے رہے مگر پھر ان کی چہکاروں میں بھی کمی آتی گئی۔

"اب بھوک برداشت نہیں ہوگی بھائی جان" اچانک سائرہ نے کہا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بجے تھے "بھوک تو لگی ہے" میں بڑبڑایا۔

"کھانے کی چیزیں تو بس میں ہی ہیں" نعیم نے کہا۔

"تو چلو' اوپر ہی چلتے ہیں۔ بس میں بیٹھ کر کھائیں گے۔"

واپس جاتے ہوئے طاہر نے مجھے آواز دی "کہاں چل دیئے ظفر بھائی؟" راحیلہ بدستور اس کے ساتھ تھی۔

میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا "کیا بات ہے' تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے؟"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "......... لگ تو رہی ہے۔"

"تو چلو ہمارے ساتھ۔"

طاہر اور راحیلہ بھی ہم سے آملے۔ ہم سڑک پر چڑھنے لگے۔ راحیلہ سائرہ کے ساتھ ہو گئی تھی۔ میں نے طاہر سے پوچھا "بھوک لگ بھی رہی ہے یا نہیں۔"

"آپ نے پوچھا تو احساس ہوا کہ بھوک لگ رہی ہے ورنہ خیال ہی نہیں تھا۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے" میں نے گنگناتے ہوئے کہا "اس طرح کے کاموں میں۔"

طاہر نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور اچھل پڑا "ارے......... پونے تین بج گئے۔ کمال ہے، پتا ہی نہیں چلا۔"

"اور ادھر ہم بے زاری کی آخری حد کو پہنچ گئے۔"

طاہر جھینپ گیا۔ میں نے اسے مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

ہم بس میں پہنچے تو پتا چلا کہ ہم جیسے اور بھی ہیں۔ بس میں پہلے سے خاصے لوگ موجود تھے اور سبھی حسب استطاعت پیٹ پوجا میں مصروف تھے۔ ان میں صائمہ اور اس کے کزن بھی تھے۔ ہمارے پاس بسکٹ تھے، مونگ کی دال اور دال موٹھ کی تھیلیاں تھیں اور کیلے تھے۔ نعیم نے دال کی تھیلی صائمہ کی طرف بڑھائی۔ اس نے نرم لہجے میں شکریہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ سائرہ نے نعیم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

پیٹ میں کچھ گیا تو چائے کی شدید طلب ہونے لگی "تم نے ناشتے کے وقت تھرموس بھی بھرا تھا یا بھول گئی تھیں؟" میں نے سائرہ سے پوچھا۔

"سوری بھائی جان۔ روانگی لیٹ ہونے کی وجہ سے افراتفری اتنی تھی کہ خیال ہی نہیں آیا" سائرہ نے معذرت کی۔

"برا ہوا۔ اب چائے نہ جانے کب نصیب ہو گی" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

نعیم اچانک اٹھا اور اگلی سیٹوں کی طرف چل دیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تھرموس تھا۔ "چائے حاضر ہے بھائی جان۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر سر خم کرتے ہوئے مسخرے پن سے کہا۔

"بھئی یہ بڑا کام کیا ہے تم نے" میں نے نعیم کو داد دی اور سائرہ سے کہا "پیالیاں نکالو جلدی سے۔"

"گلاس لے لیں کیونکہ میرا خیال ہے، تھرموس میں سے مری کا ٹھنڈا پانی برآمد ہو گا" سائرہ نے کہا۔ وہ نعیم سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک

دوسرے کو چھیڑتے ستاتے رہتے تھے لیکن محبت بے تحاشا کرتے تھے......... بلکہ کرتے ہیں۔

"تم اپنے لیے گلاس نکالو اور دریا کی طرف چل دو" نعیم نے اس سے کہا "لیکن جلدی کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہم تینوں کو پیالیاں دے دو۔"

سائرہ نے پیالیاں نکالیں۔ میں نے انڈیلا تو تھرموس میں سے چائے ہی برآمد ہوئی۔ نعیم تاؤ دلانے والے انداز میں مسکرانے لگا۔ سائرہ کھسیا گئی "کھوٹے سکے بھی کبھی کبھی کام آجاتے ہیں" اس نے چوٹ کی۔

"وہ تمہارے پرس میں اب بھی موجود ہوں گے۔ میں تو زمانے کے ساتھ چلتا ہوں۔ میری جیب میں کرارے کرنسی نوٹ ہوتے ہیں" نعیم نے ترکی بہ ترکی کہا پھر وہ میری طرف مڑا "روانگی میں دیر ہو رہی تھی۔ میں باہر ہوٹل سے چائے بھروا لایا تھا تھرموس میں۔ ویسے بھائی جان، کھوٹے سکے واقعی کبھی کبھی کام آجاتے ہیں، اتنی جلدی پیالیاں نکال لیں سائرہ نے۔"

"ویسے بھائی جان" سائرہ بھی نعیم ہی کے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "ان کی زبان کو اسی وقت دھار لگتی ہے جب انہیں کوئی سالانہ نسواں ذم چھلا لاحق ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ وقت آگیا۔"

اب نعیم کے کھسیانے کی باری تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ صائمہ کن انکھیوں سے ہم لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہچکچا رہی تھی لیکن میرا اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں تھا۔ خواہ مخواہ وہ بھڑک جاتی۔ طاہر نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ "مس صائمہ......... چائے لیں گی آپ؟" اس نے پوچھا۔

صائمہ نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولی "اگر بچی ہو تو دے دیں۔"

"پیالی ہے آپ کے پاس؟"

صائمہ نے ایک مگ اس کی طرف بڑھا دیا پھر وہ چائے لیتے ہوئے بولی "بہت

شکریہ۔ شدید طلب ہو رہی تھی چائے کی۔"

اس بار ہم لوگ بس سے اترے تو ساڑھے تین بج چکے تھے۔ گری ہوئی سڑک کے سامنے موجود مجمع بڑی حد تک چھٹ چکا تھا۔ مالک صاحب مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ گاڑیوں کی واپسی کا کام شروع ہو گیا ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے۔

"سر ممنون اب تک نہیں آئے ہیں؟" میں نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"آئے تھے کھانے کے لیے کچھ بسکٹ لے کر واپس چلے گئے۔"

ہم لوگ پیچھے جا کر گاڑیوں کی واپسی کا منظر دیکھنے لگے۔ سوا چار بجے کے قریب سر ممنون کی وسل کی آواز سنائی دی۔ ہم لپکے، سر ممنون بس کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ مالک صاحب تھے اور ٹیچرز کا ایک گروپ بھی موجود تھا۔

"کیا بات ہے سر........... کیا صورت حال ہے؟" طاہر نے پوچھا۔

"لڑکے جمع ہو جائیں تو بتاؤں گا۔ ان کے بغیر کوئی بات نہیں کی جا سکتی" سر ممنون نے کہا اور دوبارہ سیٹی بجائی۔

کوئی سات منٹ بعد پارٹی کے بیشتر لڑکے آ پہنچے۔ سر ممنون نے بات شروع کی۔

"میں سڑک کے اس طرف گیا تھا" انہوں نے بتایا "مقصد یہ تھا کہ مطلب کی کوئی گاڑی مل جائے تو تبادلے کی صورت نکالی جائے۔ اس طرف بھی ٹریفک کم از کم ایک کلو میٹر تک جام ہے۔ ابھی ابھی دو بسیں اس طرف آئی ہیں........ بارات کی بسیں۔ میں نے ان سے بات کی ہے کہ وہ جیسے تیسے ہماری گاڑیوں میں چلے جائیں اور ہم ان کی گاڑیوں میں۔"

"یہ تو سر نعمت مل گئی" ایک لڑکے نے کہا۔
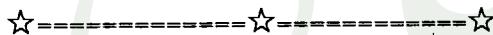
"مگر اس میں تم لوگوں کو، خاص طور پر لڑکوں کو تکلیف اٹھانا پڑے گی" سر ممنون بولے "ایک تو تمام سامان اپنی گاڑی سے اتار کر اس پر دوسری بس تک لے جانا ہو گا اور یہ بھی سن لو کہ دوسری بس کافی پیچھے کھڑی ہے۔ دوسرے کچھ لوگوں کو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے گا کیونکہ ہمیں ویگن کا کوئی متبادل نہیں ملا ہے۔ یہی ایک بس ہے۔"

"تو ویگن کا کیا بنے گا سر؟"

"ویگن لمبے راستے سے مظفر آباد پہنچے گی۔" سر ممنون نے جواب دیا "اب آپ لوگ مل بیٹھ کر فیصلہ کر لیں........ پانچ منٹ میں۔"

لڑکے سوچ میں پڑ گئے۔ کام کافی مشکل تھا۔ سامان لے کر نیچے اترنا، پھر اوپر چڑھنا اور بس تک پہنچنا۔ اس کام میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹا لگتا۔ اس کے باوجود کم از کم تین چار گھنٹے کے وقت کی بچت بھی ہو رہی تھی۔ کچھ سست طبیعت کے لڑکے ہچکچا رہے تھے لیکن بالآخر خون کی گرمی جیت گئی۔

سامان ادھر سے ادھر منتقل کیا جانے لگا۔ تھکے ہوئے چہروں پر بشاشت دوڑ گئی۔ سفر پھر شروع ہو رہا تھا۔

☆============☆============☆

اس بار بس اجنبی تھی اور سر ممنون ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ وہ ویگن میں تھے، جسے پلٹ کر مری، پھر راولپنڈی اور ایبٹ آباد ہوتے ہوئے مظفر آباد پہنچنا تھا۔ بس میں موجود لوگ بھی بجھے بجھے تھے۔ صرف نغمہ کی آواز سنائی دے رہی تھی، جو بدستور زاہد اور عمران سے الجھ رہی تھی۔ دونوں لڑکوں کی زبان بھی کھل گئی تھی۔

میرا تجربہ ہے کہ سفر میں ایک گڑبڑ ہو جائے تو دوسری بھی ضرور ہوتی ہے۔ یہی ہوا۔ بمشکل بیس منٹ سفر کر سکے ہوں گے کہ اجنبی بس خراب ہو گئی۔ ابتدا میں خیال یہ تھا کہ معمولی خرابی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی مگر پون گھنٹے کی تفتیش کے بعد ڈرائیور نے اعلان کیا کہ ایک پرزے کی ضرورت ہے۔ وہ منگوانا پڑے گا۔ چنانچہ کلینر سڑک پر جاتی ہوئی گاڑیوں کو اشارے سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ بالآخر ایک بس رکی اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔

یہ بہت زیادہ کوفت کا سامان تھا۔ بس جہاں خراب ہوئی تھی، وہ بڑا بیزار کن مقام تھا۔ دوسرے وقت بھی جھٹ پٹے کا تھا۔ دونوں وقت ملنے کا سماں ویسے بھی اداس کن ہوتا ہے۔ سبھی بیزار نظر آ رہے تھے۔ میری یہ عادت ہے کہ ایسے موقعوں پر یادوں کی

صندوقچی سے کوئی حسین مگر موقعے سے ملتی جلتی یاد نکال کر اس سے کھیلنا شروع کر دیتا ہوں۔ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔

وقت اور مقام کی بات ہوتی ہے۔ سفر کے دوران بس خراب ہونے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن کبھی کوفت اور بیزاری ہوتی ہے اور کبھی بس کی خرابی پر بے ساختہ خدا کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے' جیسا دو سال پہلے ہوا تھا۔ میں بس میں بیٹھے بیٹھے دو سال پیچھے چلا گیا۔

دو سال پہلے ہم مظفر آباد سے اٹھ مقام جا رہے تھے کہ راستے میں بس خراب ہو گئی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ ڈرائیور جیسے تیسے گاڑی ایک محفوظ موڑ تک لے گیا اور وہاں پہاڑی کی جانب گاڑی کنارے کر کے کھڑی کر دی۔ وہ یقیناً اچھا وقت تھا۔ سب لوگ خوش گوار موڈ میں تھے۔ پہلے تو سب لوگ بس میں ہی بیٹھے رہے پھر چلبلے قسم کے لڑکے اتر گئے۔ شبنم' افشاں اور وسیم ہمارے آگے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ہمارے پیچھے ایک اور گروپ تھا۔ اس میں ایک کرسچن لڑکی ایلس' فاطمہ اور ثمینہ بیٹھی تھیں۔

میں بہت اداس تھا۔ نعیم مجھے بتا چکا تھا کہ شبنم کی نہ صرف منگنی ہو چکی ہے بلکہ اس کے اور میرے درمیان عقیدے کا فرق بھی ہے۔ اب میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ میں شبنم کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔

"بھئی......... لمبا کام ہے۔ ایک پرزہ منگانا ہوگا تب بات بنے گی۔ کلینر کو بھیج رہے ہیں" سرمنون کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "جب تک آپ لوگ آبشار سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتے؟"

"آبشار؟"

"ہاں بھئی.......... یہاں سے بیس قدم دور بھی نہیں ہے۔ عابد صاحب تو آبشار کے نیچے بیٹھ چکے ہیں" سرمنون نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"گئی بھینس پانی میں" پیچھے سے انیس صاحب کی آواز سنائی دی۔ عابد صاحب پر

ہمیشہ ایسے ہی تبصرے ہوتے تھے۔ انہیں گرمی بہت لگتی تھی۔ جہاں ہم لوگ پانی میں ایک منٹ ہاتھ رکھنے کی شرطیں لگاتے تھے' وہ وہاں نہانے سے باز نہیں آتے تھے اور لطف یہ کہ انہیں چھینک تک نہیں آتی تھی۔ خراٹا ٹیم کے وہ کیپٹن تھے۔

اس بار سبھی لوگ بس سے اتر آئے۔ آبشار کو دیکھ کر میری اداسی ڈھل گئی۔ اوپر کی پہاڑی سے گرنے والا وہ آبشار کافی بڑا تھا.......... منظر اتنا خوبصورت تھا کہ آدمی سبھی کچھ بھول جائے۔ عابد صاحب قمیض اتارے آبشار کی موٹی دھار کے نیچے کسی بدھ بھکشو کی طرح آسن جمائے بیٹھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایسا سکون تھا' جیسے گیان مل گیا ہو۔

لمحوں میں ماحول بدل کر رہ گیا۔ پکنک کا سا سماں بن گیا۔ کچھ لڑکے بہتے پانی میں پاؤں ڈالے کھڑے تھے۔ کچھ کیمرے ہاتھوں میں لیے تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔ لڑکیاں بھی خوش ہو کر پانی میں اتر گئیں اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے لگیں۔ سریلی چہکاروں اور قہقہوں سے فضا بھر گئی۔ کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ ہم مجبوری میں وہاں رکے ہیں۔ سب خوب انجوائے کر رہے تھے۔

نعیم جا کر بس سے کیمرا لے آیا "بھائی جان.......... آپ یہاں کھڑے ہوں۔ میں آپ کی ایک یادگار تصویر لوں گا۔"

میں اس کی ہدایت کے مطابق کھڑا ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' کچھ اوپر ایک بڑے پتھر پر شبنم دو لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں فوراً نعیم کی طرف متوجہ ہو گیا جو گھٹنوں کے بل بیٹھا پوز بنا رہا تھا۔ خاصی دیر تک وہ ادھر ادھر ہوتا رہا۔ شاید وہ پورے آبشار کو بھی فوکس کرنا چاہ رہا تھا۔

بالآخر وہ مطمئن ہوا اور اس نے بٹن دبا دیا۔ "یہ تصویر انشاء اللہ دیکھیں گے تو پھڑک جائیں گے" نعیم نے کہا۔

دو گھنٹے اس پکنک میں گزر گئے۔ کسی کو بھی وقت کا احساس نہیں رہا۔ ایک بجے کے قریب میں بس کی طرف واپس آیا۔ ڈرائیور سفیر شاہ ایک درخت کے سائے میں لیٹا

سو رہا تھا۔ میں بس میں چلا گیا۔ بھوک بہت لگ رہی تھی۔ میں نے بسکٹ کا پورا پیکٹ صاف کر دیا پھر تاش کی گڈی نکالی اور پیشنس کھیلنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد بس میں اچھے خاصے لوگ واپس آ گئے۔ سبھی کو بھوک ستا رہی تھی۔ سب سے پہلے پیچھے کی سیٹ والی لڑکیاں آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے بیگ کھولے اور چپس کے پیکٹ نکال لئے۔ اچانک ایلس کی نظر مجھ پر پڑی "کیا کر رہے ہیں ظفر؟" اس نے پوچھا پھر خود ہی بولی "ارے.......... پیشنس آتا ہے آپ کو؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا "اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میں نے کم ہی لوگوں کو اس کھیل سے واقف دیکھا ہے" وہ بولی "اور تاش کے کون سے کھیل آتے ہیں اپ کو؟"

"عام طور پر کھیلے جانے والے تمام کھیل اور برج۔"

"برج کھیلتے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں ستائش تھی "پھر تو بڑے دلچسپ آدمی ہوئے۔"

میں اس کا کیا جواب دیتا۔ اسی دوران فاطمہ بول اٹھی "سائرہ نے بتایا ہے کہ آپ ہاتھ بھی دیکھتے ہیں؟"

اس دوران سائرہ، نعیم، شبنم اور افشاں بھی آ گئے۔ میں نے پتے سمیٹتے ہوئے کہا "فراڈ کرتا ہوں۔ ہاتھ دیکھنا نہیں آتا مجھے۔"

"پلیز.......... میرا ہاتھ دیکھیں نا" فاطمہ نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"ہاتھ ہر وقت نہیں دیکھا جاتا" میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا "یہ جولائی کا مہینہ ہے۔ اس میں ہاتھ دیکھنے کا وقت جمعرات کے دن صبح ۵ بجے سے ۷ بجے کے درمیان ہے۔"

اس پر سب لوگ ہنسنے لگے مگر فاطمہ پریشان ہو گئی "آج تو اتوار ہے یعنی پانچ دن بعد ہاتھ دکھاؤں آپ کو؟"

"ذرا اچھی طرح ہاتھ دکھانا" سائرہ بولی۔

فاطمہ آغا خانی تھی۔ اردو میں اسے اتنی دسترس نہیں تھی کہ ہاتھ دکھانے کا مفہوم بجھتی۔ سنجیدگی سے کہنے لگی "اچھی طرح ہی دکھاؤں گی۔"

اس پر ایک اور قہقہہ پڑا۔ میں نے سائرہ سے کہا "ہاتھ تو میں تمہیں دکھاؤں گا ستانی صاحب۔ خیر.......... کچھ کھانے کو دو۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

سائرہ نے بیگ ٹٹولا پھر اس کی نظر سیٹ پر پڑے بسکٹ کے خالی پیکٹ پر پڑی بسکٹ تو پہلے ہی صاف کر دیئے آپ نے۔" اس نے مجھ پر آنکھیں نکالیں "اب بس لمٹ کے چھوٹے پیکٹ رہ گئے ہیں۔ یہ دو آپ لے لیجئے۔"

اگلی سیٹ پر شبنم نے دال سیو کا ایک بڑا پیکٹ کھول لیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی شاں چپس ٹونگ رہی تھی۔

"میرا ان بسکٹوں سے کیا کام چلے گا" میں نے سائرہ سے کہا۔ "ان علاقوں میں آ کر ری تو بھوک کھل جاتی ہے۔"

"خیال ہی نہیں رہا ورنہ اور بسکٹ لے لیتے" نعیم بولا۔

بسکٹ پیٹ میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ بھوک وہیں کی وہیں تھی یں تو مارا گیا" میں کمزور لہجے میں کراہا۔

اسی لمحے شبنم نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر اس نے دال سیو کی تقریباً بھری ہوئی تھیلی ری طرف بڑھائی "یہ لے لیجئے۔"

"ارے نہیں، اب ایسا بھی نہیں" میں جھینپ گیا۔

"پلیز، لے لیں نا۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

"لیکن.......... آپ کو بھی تو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"میں ضرورت بھر کھا چکی ہوں۔ یہ تھیلی تو میں تین دن میں بھی نہیں ختم کر ن۔"

میں پھر بھی انکار کرتا رہا مگر اب وہ مجھے ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں ان نکھوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ میں نے تھیلی لے لی۔

تھیلی ختم ہونے ہی والی تھی کہ اچانک نعیم نے سرگوشی کی۔ "کمال کرتے ہیں بھائی جان آپ۔ ممکن ہے، انہوں نے سوچا ہو کہ آپ مٹھی بھر دال سیو لے کر تھیلی واپس کر دیں گے۔ آپ تو پوری تھیلی ہڑپ کر گئے۔ وہ مروت میں ماری گئیں۔"

میں کھسیا گیا۔ واقعی .... بھوک میں مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ شبنم نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں پوری تھیلی لے لوں.........

اسی لمحے شبنم پلٹی "ایسی کوئی بات نہیں نعیم۔ میں نے وہ رسماً اور مروتاً نہیں کہا تھا۔ ہاں......... آپ چائے پیتے وقت مجھے یاد رکھیے گا۔"

چائے پینے کے بعد ہم لوگ پھر باہر آ گئے۔ ادھر کلینر مطلوبہ پرزہ لے آیا تھا۔ سفیر شاہ بس کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ کوئی بیس منٹ بعد اس نے خوش خبری سنائی کہ سفر دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔

اب سفر چڑھائی کا تھا۔ مظفر آباد سے آگے کا راستہ بہت خوب صورت ہے۔ دریائے نیلم نیچے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور نیلم کے اس طرف وہ کشمیر ہے، جو بھارت نے غصب کر رکھا ہے۔ کہیں کہیں تو باقاعدہ بھارتی فوجیوں کی رائفلوں کی جھلک بھی نظر آ جاتی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے موسم حسین ہو گیا۔ ہلکی پھوار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں پر جیسے موتی بکھر گئے۔ ایسے موسم میں سفر خطرناک ہو جاتا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ آدمی مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ خطرناکی کا کسی کو احساس ہی نہیں رہتا۔

سر ممنون نے کھڑے ہو کر کہا "مجھے افسوس ہے کہ لڑکیاں بہت بدذوق ثابت ہو رہی ہیں۔ اتنے حسین موسم میں بھی آواز بند ہے۔ ارے کچھ گاؤ نا۔"

لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکتی رہیں۔ شبنم کھڑکی سے باہر کے حسین منظر کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اس کی ایک آنکھ میں مجھے دھنک کے تمام رنگ نظر آ رہے تھے۔ اس کے چہرے کی ایک سائڈ میرے سامنے تھی اور میں ماحول کے حسن اور اپنے عہد کو بھول کر اسے تک رہا تھا۔

اچانک اس کے ہونٹ ہلے اور اس کی سریلی آواز بس میں گونجی......... "میں نے ہماری گاگر سے کبھی پانی پیا تھا، پیاسا تھا میں........."

بس میں چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ اس کی آواز کے سوا کہیں کچھ نہیں تھا ہر اس میں اور لڑکیوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔

سماں بندھ گیا۔ وہ لڑکے جو خود کبھی گاتے نہیں اور دوسرے گائیں تو ان کا مذاق ڑاتے ہیں، دم بخود بیٹھے تھے۔ باہر بوندوں کی رم جھم تھی اور اندر کئی لڑکیوں کی ملی جلی آواز......... میں نے تمہاری گاگر سے........."

گیت ختم ہو گیا تو بس میں ایسا گہرا سناٹا ہو گیا، جیسا گھنے جنگلوں میں ہوتا ہے۔

اس سناٹے کو اس بار سائرہ کی آواز نے توڑا......... "میرا دل ہے پاکستان۔ میری ہان ہے پاکستان۔" پھر اور آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔

اس کے بعد شبنم نے ہی جلے تو جلاؤ گوری، پیت کا الاؤ گوری۔ ابھی نہ بجھاؤ گوری......... ابھی سے بجھاؤ نا......... شروع کیا۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ وہ بدستور باہر دیکھ رہی تھی لیکن کبھی وہ چہرے کو ذرا سا موڑتی اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی۔ "پیت میں بجوگ بھی ہے۔ آتما کا سوگ بھی ہے۔ پیت برا روگ بھی ہے......... ابھی سے بجھاؤ نا۔" اس بار وہ اکیلے ہی گا رہی تھی۔ دوسری لڑکیاں صرف تالیاں بجا رہی تھیں۔ "اور بھی ہزار ہوں گے......... جو کہ دعوے دار ہوں گے......... آپ پہ نثار ہوں گے......... کبھی آزماؤ نا......... ابھی سے بجھاؤ نا۔"

بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں، جن کا اس زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا......... نہیں رہتا۔ وہ تو جنت کے لمحے ہوتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ان میں ذہنوں کی ہر پریشانی، دل کا ہر وسوسہ اور روح کا ہر درد مٹ جاتا ہے۔ سرشاری کے سوا کچھ بھی نہیں رہتا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ صرف میرے لیے نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لیے ایسے ہی لمحے تھے۔ پھر ان لمحوں کی تکمیل یوں ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر بہت بڑی، ہت حسین سات رنگوں کی کمان نمودار ہو گئی......... ایک پہاڑ کے پیچھے سے دوسرے

پہاڑ کے پیچھے تک۔ ابن انشاء کے گیت کے بول ختم ہو چکے تھے لیکن ماحول میں ان کی باز گشت اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

سب لوگ ہماری سائڈ کی کھڑکیوں کی طرف جھک آئے تھے.......... دھنک دیکھنے کے لیے۔ بے ساختہ کلمات تحسین کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں تھی مگر وہ دھنک جتنی تیزی سے نمودار ہوئی تھی' اس سے زیادہ تیزی سے تحلیل ہو گئی۔ آہیں بھرتے ہوئے ہیولے پیچھے ہٹنے لگے۔

اس بار شبنم کی آواز کے ساتھ دھنک مجھے اپنے سینے میں نمودار ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ گا رہی تھی.......... "کبھی ہم خوب صورت تھے' کتابوں میں بسی خوشبو کی مانند.......... پرندوں کے پروں پر نظمیں لکھ کر دور کی جھیلوں میں رہنے والے.......... ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو.......... کہ ہم کو تتلیوں کے.......... جگنوؤں کے دیس جانا ہے۔ ہمیں رنگوں کے جگنو.......... روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں۔"

میں ان ساعتوں کے حسن کو۔ اس حسن کے طلسم کو بیان نہیں کر سکتا۔ ہم جیسے وقت کی ایک موج کے دوش پر تھے' جسے کسی سحر نے ساکت کر دیا تھا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ یہ طلسم اس وقت ٹوٹا' جب ہم اٹھ مقام پہنچ گئے۔

طلسم ٹوٹا تو حقیقی دنیا میں صرف بھوک سب سے بڑی حقیقت تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ "سر.......... بس یہیں لاری اسٹینڈ پر رکوایئے۔" میں نے سر ممنون کو پکارا "میں منور سے کہتا ہوں کہ کھانے کا بندوبست کرے۔"

سر ممنون مسکرائے اور انہوں نے سفیر شاہ کو گاڑی روکنے کو کہا مگر اترنے والا میں اکیلا نہیں تھا۔ بھوک بہت لوگوں کو ستا رہی تھی۔ اترنے والوں میں شبنم بھی تھی۔ سامنے ہی ہوٹل تھا' جس کا مینیجر منور تھا۔ اس سے میری دوستی تین سال پہلے ہوئی تھی۔

منور مجھ سے لپٹ گیا۔ ساتھ ہی اس نے کام کرنے والے لڑکے سے کہا "جا بیٹا' گوشت' دال سبزی جو کچھ بھی ملے لے آ۔ اور ہاں.......... بابے سے کہنا' تندور گرم

کرے" پھر وہ باقی لوگوں سے گرم جوشی سے ملا۔ مجھ سے کراچی کا حال احوال پوچھنے لگا۔

وہ ہمیں بڑے ہال میں ایک کونے میں بنے کشادہ فیملی روم میں لے گیا۔ اس کی کھڑکی سے سامنے ہی دریائے نیلم اور اس کے پار مقبوضہ کشمیر میں ہندوؤں کی آبادی نظر آتی ہے۔ یہاں سے آگے تک دریائے نیلم ہی کشمیر کے آزاد اور غصب شدہ حصے کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔"

"اور کیا حال چال ہے منور؟"

"بس ظفر صاحب' اب تو فائرنگ کے واقعات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آبادی محفوظ نہیں ہو سکتا ہے۔ اگلے سال آپ لوگوں کو یہاں تک بھی نہیں آنے دیا جائے" منور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے تو لگتا ہے' تھوڑے ہی دنوں میں اٹھ مقام خالی کرا لیا جائے گا۔ کتے اندھا دھند فائرنگ کرتے ہیں۔ یہ شیشہ دیکھیں۔"

اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم نے دیکھا۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا "کیا ہوا؟"

"ابھی چند روز پہلے ہی فائرنگ ہوئی تھی۔ شکر ہے' جانی نقصان نہیں ہوا۔"

کچھ دیر کشمیر کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں پھر منور اٹھ گیا۔ "اب میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ آپ لوگ بھوکے ہوں گے۔"

"کتنی دیر لگے گی منور بھائی!" نعیم نے پوچھا۔

"گھنٹا ڈیڑھ تو لگے گا۔ جب تک چائے بھجوا دوں؟"

"ہاں.......... اور پانی بھی۔"

منور چلا گیا۔ دو منٹ بعد لڑکا پانی کا جگ اور گلاس لے آیا۔ نعیم نے پانی گلاس میں انڈیل کر شبنم کی طرف بڑھایا۔ "لیجیے.......... کشمیر کا پانی پی کر دیکھیے۔ آدھے گھنٹے تو آپ کو بھوک نہیں لگے گی" اس کا تجربہ ہمیں پہلی بار یہاں آ کر ہوا تھا۔ پانی پی کر احساس ہوتا تھا کہ کھانا کھا لیا ہے۔

شبنم نے پانی پیا اور بولی "واقعی.......... اتنا خوش ذائقہ اور فرحت بخش پانی میں

نے آج تک نہیں پیا۔ لگتا ہے' اندر روشنی اور طاقت بھر گئی ہے۔"

میں بھی ہمیشہ یہی کہتا تھا۔
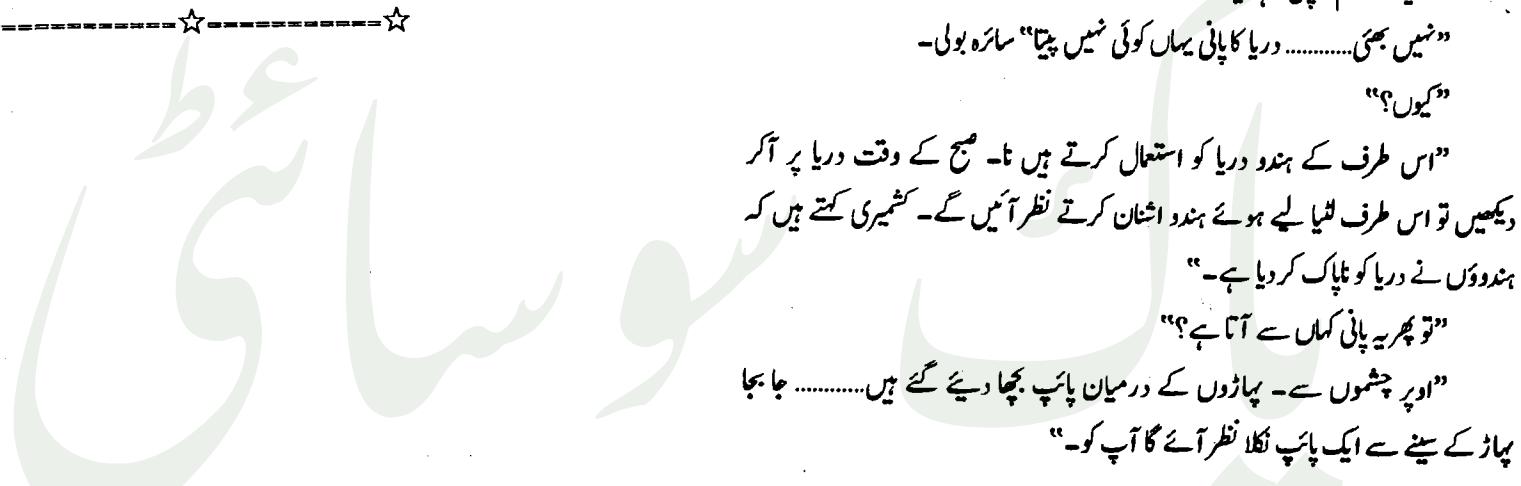
"دریائے نیلم کا پانی ہے یہ؟"

"نہیں بھئی.......... دریا کا پانی یہاں کوئی نہیں پیتا" سائرہ بولی۔

"کیوں؟"

"اس طرف کے ہندو دریا کو استعمال کرتے ہیں نا۔ صبح کے وقت دریا پر آکر دیکھیں تو اس طرف لٹیا لیے ہوئے ہندو اشنان کرتے نظر آئیں گے۔ کشمیری کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے دریا کو ناپاک کر دیا ہے۔"

"تو پھر یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"اوپر چشموں سے۔ پہاڑوں کے درمیان پائپ بچھا دیئے گئے ہیں.......... جا بجا پہاڑ کے سینے سے ایک پائپ نکلا نظر آئے گا آپ کو۔"

☆ ☆ ☆

میں بری طرح چونکا۔ کوئی مجھے ہلا رہا تھا۔ کھلی آنکھوں کے سامنے ہی منظر بدلا تو میں حیران رہ گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" میں نے طاہر سے پوچھا۔

"کہاں کھوئے رہتے ہیں آپ؟"

"بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی" میں نے بات بنائی "کچھ بات بنی؟"

"جی ہاں۔ کلینر پرزہ لے آیا ہے۔ شاید دس پندرہ منٹ میں روانگی ممکن ہو جائے۔"

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔

نو بجے ہم دوبارہ مظفر آباد کے لیے چلے۔ اس وقت تک سب مضمحل ہو چکے تھے۔ ہمارے گروپ کے سوا کسی کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ سب کے چہرے

ستے ہوئے تھے۔ میرا اپنا بھوک سے برا حال تھا لیکن اب کچھ اور کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سوچ لیا تھا کہ اب کھانا ہی کھاؤں گا۔

میں پھر اتھ مقام کی دو سال پرانی یادوں میں گم ہو گیا۔

اتھ مقام میرے پسندیدہ ترین مقامات میں سے ہے۔ وہاں کے ہائی اسکول میں پارٹی کا قیام ہوتا ہے۔ اسکول بہت بڑا ہے۔ گیٹ سے داخل ہو کر گراؤنڈ آتا ہے.......... بہت بڑا گراؤنڈ' جسے سلیقے سے بنایا جائے تو کرکٹ' فٹ بال اور ہاکی کے گراؤنڈ بہ آسانی نکل سکتے ہیں۔ گراؤنڈ پار کرتے ہی اسٹیڈیم طرز کی سیڑھیاں ہیں۔ اس کے بعد اسکول کی عمارت شروع ہوتی ہے۔

وہ بے حد تاریک رات تھی۔ چاند سے محروم رات۔ لیکن آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ میں ایک سیڑھی پر لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی میری۔ اتنے زیادہ ستارے میں نے اتھ مقام کے سوا کہیں نہیں دیکھے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ ستاروں کی روشنی بھی کم نہیں ہوتی اور آسمان اتنا قریب محسوس ہوتا ہے کہ یقین ہونے لگتا ہے ہاتھ بڑھائیں تو کوئی بھی من پسند ستارہ توڑ سکتے ہیں۔ یہ یقین ایسا ہوتا ہے کہ میں نے تو کئی بار سچ مچ ہاتھ اوپر اٹھالیا۔ تب ایسا لگا کہ آسمان بس ذرا سا دور ہے۔ ذرا سا اچکیں تو اسے چھو سکتے ہیں۔

سردی اچھی خاصی تھی۔ چادر اوڑھنے کے باوجود میرے جسم میں تھرتھراہٹ تھی مگر اٹھ کر اندر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں ستاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اتنے ستارے.......... لگتا ہے' ستارے پر ستارہ دھرا ہوا ہے۔ میں بے اختیار ساغر صدیقی کا شعر گنگنانے لگا ؎

کوئی ستارہ نہ آجائے پاؤں کے نیچے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

ایسے میں قدموں کی چاپ سنائی دی تو دل دھڑک اٹھا۔ ایسے ماحول میں تو جنوں اور پریوں کا فکشن حقیقت معلوم ہونے لگتا ہے۔ میں نے پہلو بدل کر آہٹ کی سمت دیکھا۔ ایک ہیولا میری طرف بڑھا آرہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سرہانے رکھی ٹارچ اٹھالی۔

"بھائی جان..........!"

نعیم کی آواز میں نے پہچان لی "ہاں.......... یہ میں ہوں۔"

وہ میرے پاس آبیٹھا۔ میں نے سگریٹ سلگالی "کیسی خوب صورت رات ہے" نعیم نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ ایسے ماحول میں' ایسی اندھیری رات میں ستاروں بھرے آسمان کے نیچے ہی تو آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ خدا کا نائب' خدا کے سوا سب سے اشرف ہونے کے باوجود وہ کتنا چھوٹا' کتنا حقیر ہے۔ یہ آنکھ بھر آسمان تو بے کراں کائنات کا ایک چھوٹا بہت چھوٹا حصہ ہے اور اس آنکھ بھر آسمان میں جتنے ستارے ہیں' انہیں گننا تو درکنار' ان کی تعداد کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تب احساس ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے کیسے جھکنا چاہیے.......... کیسے سپردگی اختیار کرنی چاہیے.......... کیسے ہر پل اس کی عبادت کرنا چاہیے۔ مگر دن کی روشنی میں سب پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔"

"واقعی بھائی جان میں بھی اس وقت خود کو بہت چھوٹا محسوس کر رہا ہوں۔"

ہم کچھ دیر خاموش رہے۔ ایسے وقت میں خود اپنا بولنا بھی اچھا نہیں لگتا۔

اچانک نعیم نے کہا۔ "آج شبنم باجی سے بہت باتیں ہوئیں۔"

"اچھا!" میں نے بے پروائی سے کہا لیکن صرف اس کے نام سے ہی میری دھڑکنیں بے ربط ہو گئی تھیں۔

"پتا ہے' ان کے ساتھ جو ان کی کزن ہے.......... افشاں اس کے بھائی سے ان کی منگنی ہوئی ہے۔"

"گڈ نیوز۔"

"منگنی بچپن میں ہوئی تھی.......... اور وہ اپنے منگیتر کو پسند نہیں کرتیں۔"

"ویری بیڈ۔"

نعیم جانتا ہے کہ میں انگریزی میں اس طرح کے تبصرے اس وقت کرتا ہوں' جب بہت زیادہ اپ سیٹ ہوں' "بھائی جان.......... وہ واقعی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں اور یہ لوگ لبرل قسم کے ہیں۔"

"تو بھائی' مجھے اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"اور وہ آپ کو پسند کرتی ہیں۔ آپ پہلی نظر میں انہیں اچھے لگے تھے۔"

اچانک مجھے لگا کہ میں حقیر بھنگا بڑا ہوتا جا رہا ہوں.......... بڑا اور لمبا۔ میرا سر آسمان کو چھونے لگا۔ چھوٹے چھوٹے حقیر ستارے میری دسترس میں تھے۔ میں چاہتا تو انہیں نوچ کر پھینک دیتا۔ میں چلتا تو وہ میرے پاؤں کے نیچے آجاتے اور مجھے احساس تک نہ ہوتا۔ میں.......... اشرف المخلوقات کی کائنات کی طرح بے کراں ہو گیا تھا..........

☆==========☆==========☆

اس بار کسی کو مجھے جھنجوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بس میں شور اتنا ہو رہا تھا کہ جس نے مجھے تصور کی دنیا سے کھینچ لیا۔ طاہر سے کچھ پوچھتا تو وہ کہتا کہ آپ نہ جانے کس دنیا میں گم رہتے ہیں۔ چنانچہ میں خود ہی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

نغمہ کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ وہ گلا پھاڑ کر چلا رہی تھی.......... "وی وانٹ ڈنر' وی وانٹ ڈنر" کچھ اور آوازیں بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ زاہد اور عمران نغمہ کو ہوٹ کر رہے تھے لیکن وہ ان کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھی۔

سر ممنون موجود نہیں تھے کہ وہ صورت حال کو سنبھالتے۔ مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ میں پلٹا' نغمہ ایک سیٹ چھوڑ کر ہمارے پیچھے بیٹھی تھی۔ میں نے دہاڑ کر کہا "شٹ اپ۔ یہ بکواس بند کرو اور میری بات کا جواب دو۔"

نغمہ اپنا راگ الاپتی رہی.......... "وی وانٹ ڈنر' وی وانٹ ڈنر.........."

"ڈنر میں تم لوگوں کو ابھی کراؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ' کتنے کورس کا ڈنر چاہئے تمہیں۔"

نغمہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ بس میں سناٹا چھا گیا۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کھاتے پیتے گھر کی بھوکی لڑکی ہو۔" میں غرایا۔ مجھے غصہ اچانک ہی آیا تھا اور ایسے میں' میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں۔ "اور امریکیوں کی نقالی کرتی ہو۔ مجھے بتاؤ' تمہیں کتنے کورس کا ڈنر چاہئے۔ بولو۔"

نغمہ نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپایا اور شاید رونے لگی۔

"بہت اچھا دہاڑ لیتے ہیں آپ۔" اچانک صائمہ کی آواز ابھری۔ "ہم سب بھوکے ہیں اور ہمارا مطالبہ بھی یہی ہے۔ اگر آپ ابھی کھانا فراہم کرنے کا وعدہ کریں تو میں بتاؤں کہ ہمیں کتنے کورس کا ڈنر چاہئے۔ ہم پورے دن کے بھوکے ہیں۔ یہ کس کی ذمے داری ہے۔"

"سب کی اپنی اپنی ذمے داری ہے۔" میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

"جی نہیں۔ سرکلر کے مطابق صرف ریلوے سفر کے دوران افراد اپنے طعام کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اب انتظامیہ کی ذمے داری ہے۔"

"اگر آپ نے سرکلر کو غور سے پڑھ لیا ہوتا تو اس میں یہ مشورہ بھی نظر آجاتا کہ ایمرجنسی کے لئے خشک غذا ہمیشہ ساتھ رکھی جائے۔ گاڑی خراب ہونے' پل گر جانے' سیلاب آجانے اور لینڈ سلائیڈ ہو جانے پر تو ملکی انتظامیہ کو بھی اختیار نہیں۔ یہ بے چاری ٹوور کی انتظامیہ کس شمار و قطار میں ہے۔"

صائمہ نے بے حد نامعقولیت کا مظاہرہ کیا۔ "بہرحال عوام کو احتجاج سے ملکی انتظامیہ بھی باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ بے چاری ٹوور انتظامیہ کس شمار و قطار میں ہے" اس نے کہا اور زور زور سے.......... وی وانٹ کھانا' وی وانٹ کھانا کے نعرے لگانے لگی۔ پہلے اس کے عم زاد ہم آواز ہوئے پھر کچھ اور لوگ بھی نعرے لگانے لگے۔ ہلڑ بازی پہلے سے سوا ہو گئی۔

"خاموش ہو جاؤ۔" میں چلایا۔ "بڑے بے حس ہو تم لوگ۔ ان راستوں پر سفر کرنے کی بھی تمیز نہیں تمہیں۔ ان خطرناک راستوں پر ڈرائیور کے ارتکاز کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ذرا کھڑکی سے باہر دیکھو۔ یہ سفر تو دن میں بھی احتیاط کا تقاضا کرتا ہے جب کہ یہ رات کا وقت ہے۔ جانتے ہو' ملک میں سب سے زیادہ حادثے انہی اطراف میں ہوتے ہیں۔ تم لوگ شور مچا کر ڈرائیور کو ڈسٹرب کر رہے ہو۔ خاموش ہو جاؤ۔"

اس کا اچھا خاصا اثر ہوا۔ شور خاصا کم ہو گیا لیکن صائمہ اب بھی نعرے لگا رہی تھی۔ اس کے کزن بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ "اب میں آخری بار سمجھا رہا ہوں تم لوگوں کو"۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک بار کھڑکی سے باہر دیکھ لو۔ اس لئے کہ اب یہ شوروغل ختم نہ ہوا تو میں گاڑی رکوا دوں گا پھر تم لوگ اطمینان سے صبح تک احتجاج سے پیٹ بھرنا۔" پھر میں نے ڈرائیور کو آواز دی۔ "شاہ جی.......... اگر یہ شوروغل نہ رکے تو آگے جہاں بھی جگہ نظر آئے گاڑی کنارے کر کے کھڑی کر دینا۔"

یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ صائمہ کے دونوں کزن بھی سہم کر چپ ہو گئے۔ صائمہ کو جب اکیلے رہ جانے کا احساس ہوا تو وہ بھی کھسیا کر خاموش ہو گئی لیکن شرر بار نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تھینک یو صائمہ.......... تھینک یو ویری مچ۔"

اس نے منہ پھیر لیا۔

دس بجے ہمیں مظفر آباد کی جگمگاتی روشنیاں نظر آئیں۔ سوا دس بجے ہم مظفر آباد میں تھے۔ میں' نعیم اور طاہر چند لڑکوں کو ساتھ لے کر کھانے کی تلاش میں نکلے۔ جہاں سے جو کچھ بھی ملا' لے آئے۔ ساڑھے گیارہ بجے سب نے کھانا کھایا۔ سر ممنون رات ڈیڑھ بجے پہنچے۔

☆----------☆----------☆

اگلے روز ماحول میں بڑی کشیدگی تھی۔ صائمہ کے تیور اچھے نہیں تھے۔ وہ اپنے کزن شاہد اور ندیم اور ان کے دو دوستوں کے ساتھ سکول کے گراؤنڈ میں ٹہل رہی

تھی۔ بعد میں وہ لڑکے اور لڑکوں سے رابطہ کرتے نظر آئے۔ لگتا تھا' بغاوت کی تیاری ہو رہی ہے۔ مظفر آباد میں ہمیں ایک دن قیام کر کے اگلے روز اٹھ مقام کے لئے روانہ ہونا تھا۔ بیشتر لوگ.......... خصوصاً خواتین ناشتے کے فوراً بعد شاپنگ کی غرض سے نکل کھڑی ہوئیں۔ میں اور نعیم طاہر کو لے کر نکل آئے لیکن طاہر کو مظفر آباد نے بہت مایوس کیا تھا۔

"تو یہ ہے کشمیر۔" وہ بڑبڑایا۔ "میرے تو خواب چکنا چور ہو گئے۔"

"شہر دنیا میں کہیں بھی ہوں' کم و بیش ایک جیسے ہوتے ہیں۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "کشمیر تم آگے چل کر دیکھ ہی لو گے مگر مظفر آباد سے بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ واپس چلو۔ تمہیں ایک جگہ لے کر چلیں گے۔"

نعیم مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کہاں کی بات کر رہا ہوں۔

ہم سکول واپس گئے۔ وہاں سے میلے کپڑے اور صابن لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت دس بجے تھے۔ طاہر کو گرمی نے بے حال کر دیا تھا۔ وہ بار بار بڑبڑا رہا تھا.......... کشمیر میں اتنی گرمی۔ میں اور نعیم اس کی پریشانی اور بیزاری پر مسکرا رہے تھے۔

ہم اس پگڈنڈی پر چل دئے' جو اوپر کی طرف جاتی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد مظفر آباد کے مخصوص ماحول کے تمام آثار غائب ہو گئے اور کشمیر کا حسن نمایاں ہوتا چلا گیا۔ طاہر کی نگاہوں میں حیرت پھیلتی گئی۔ "ارے ظفر بھائی' یہ تو جادو کے زور سے جیسے سب کچھ بدل گیا اور کمال یہ ہے کہ مجھے محسوس بھی نہیں ہوا۔"

"چلتے رہو۔ الفاظ ضائع مت کرو۔ آگے ان کی زیادہ ضرورت پڑے گی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

جیسے جیسے ہم بڑھتے گئے' گرمی کم ہوتی گئی۔ اردگرد درخت تھے' سبزہ ہی سبزہ تھا' جو خنکی کا احساس دلا رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر طاہر نے کہا۔ "ظفر بھائی' پیاس لگ رہی ہے شدید۔ پانی ملے گا کہیں۔"

"ذرا سی دیر صبر کر لو۔ ابھی سرکاری نلکے پر پہنچ جائیں گے۔"

کوئی دو منٹ بعد ہم سرکاری نلکے پر پہنچ گئے۔ "لو بھئی' نلکا آگیا لیکن ابھی پانی

چھوڑا نہیں گیا ہے۔" میں نے کہا۔

طاہر نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔"

میں نے سامنے والی پہاڑی دیوار کے سینے سے باہر نکلے ہوئے پائپ کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کیا ہے؟"

"یہ........ یہ........" طاہر حیران رہ گیا۔ "یہ کیسے نکلا ہے؟"

"کشمیر میں تمہیں ہر جگہ ایسے نل ملیں گے۔ آؤ........ یہاں بیٹھ کر کچھ دیر ستاتے ہیں۔ شاید تھوڑی دیر میں پانی آ جائے۔"

وہاں درخت اور بیلیں بکثرت تھیں۔ ایسی خوشگوار خنکی تھی کہ خواہ مخواہ نیند آ جائے۔ گرمی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہم وہاں کچھ دیر بیٹھے ہوں گے کہ پائپ سے پانی آنے لگا۔ "لو........ پانی آ گیا۔ پانی پی لو۔" میں نے طاہر سے کہا۔

طاہر بڑی بے دلی سے پائپ کی طرف گیا اور دونوں ہاتھوں سے اوک بنا کر پانی پینے لگا۔ لمحوں میں اس کی بے دلی غائب ہو گئی۔ "سبحان اللہ........ کیسا خوش ذائقہ پانی ہے۔" اس نے پائپ کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں کتنی ٹھنڈک اور سکون ہے۔"

میں نے اور نعیم نے بھی پانی پیا۔ طاہر وہیں ڈیرا ڈال دینا چاہتا تھا مگر اسے لے کر اوپر چل پڑے۔ کولر میں ہم نے پانی بھر لیا تھا۔ اوپر پہاڑی اور درختوں کا وہ چھوٹا سا جھنڈ تھا' جسے ہم جنگل کہتے تھے۔ وہاں پانی کا کچھ چوڑا نالا تھا۔ ہم شہر کے لوگ نالے سے صرف گندا تصور لیتے ہیں لیکن پہاڑی نالا اتنے شفاف پانی کا ہوتا ہے کہ پرسکون انداز میں بہتا ہوا پانی دیکھ کر لگتا ہے کہ زمین پر شیشہ بچھا دیا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس جھنڈ میں گرمی بھی داخل نہیں ہوتی ہو گی۔

ہم وہاں کچھ دیر لیٹ کر ستاتے رہے پھر ادھر ادھر گھومے پھرے اور آخر میں' میں نے اور نعیم نے کپڑے دھوئے۔ طاہر پچھتاتا اور شکایت کرتا رہا کہ ہم نے اسے بتایا نہیں ورنہ وہ بھی اپنے ساتھ کپڑے لے آتا۔ اب تک لانڈری میں کپڑے دینے کی

مہلت کہیں نہیں ملی تھی۔

کپڑے دھونے کے بعد ہم نے انہیں خوب نچوڑ کر جھنڈ سے باہر دھوپ میں زمین پر پھیلا دیا اور اوپر بھاری پتھر رکھ دیئے پھر ہم نالے میں کھڑے ہو کر نہائے۔ اس بار طاہر بھی ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ نہانے کے بعد ہم تینوں ہی سو گئے۔

کپڑوں کی گٹھڑی ساتھ لئے ہم سکول واپس پہنچے تو اس وقت چار بجنے والے تھے۔ حسین بخش سے کھانے کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ ہم باہر بھاگے۔ ہوٹل سکول سے زیادہ دور نہیں تھا۔

کھانا کھا کر واپس آئے تو ہماری سر ممنون کے سامنے پیشی ہو گئی۔ وہاں صائمہ اور سائرہ پہلے سے موجود تھیں۔ "آؤ بھئی........ تم لوگوں کی شکایتیں آ رہی ہیں۔" سر ممنون نے کہا۔

"فرمائیے سر۔"

سر ممنون دونوں لڑکیوں کے طرف متوجہ ہوئے۔ "اب تم لوگ اپنی شکایت خود ہی بتا دو۔"

"سر........ پارٹی میں لوگ اس لئے شامل ہوتے ہیں کہ اجتماعی طور پر بہتر تفریح ہو جاتی ہے۔" صائمہ نے کہا۔ "اور یہ لوگ کیونکہ پہلے بھی آتے رہے ہیں' لہٰذا تفریح کے مقامات کے واقف ہیں۔ انہیں کہیں جاتے ہوئے دوسروں سے ضرور پوچھ لینا چاہئے تھا۔"

"میری شکایت بھی یہی ہے سر۔" سائرہ بولی۔

سر ممنون نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی جواب ہے اس معقول بات کا؟"

"جی ہاں۔ اجتماعی تفریح میں بڑا گروپ مشترکہ دلچسپیوں کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے گروپس میں تقسیم ہو جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر سائرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سائرہ کی دلچسپی شاپنگ میں تھی۔ جس وقت ہم گئے تو یہ موجود ہی نہیں تھی۔"

سائرہ کھسیائی۔ "آپ کو مجھے صبح ہی بتانا چاہئے تھا۔"

"یہ اعتراض غلط ہے۔" سر ممنون نے کہا پھر وہ مجھ سے بولے۔ "لیکن صائمہ تو کہیں نہیں گئی۔ صبح ہی سے سکول میں موجود ہے۔"

"جی ہاں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ بھوکے گروپ سے تعلق رکھتی ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایسے لوگوں کو قدرتی مناظر سے زیادہ دلچسپی کھانے میں ہوتی ہے۔ میں نے یہ سوچا' یہ یہاں رک کر حسین بخش کو جلد از جلد اور بہتر کھانا پکانے کے سلسلے میں گائیڈ کرنا زیادہ پسند کریں گی۔" سر ممنون کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ "اپنی اس ترجیح کا عظیم الشان مظاہرہ یہ کل رات کر چکی ہیں۔ تفصیل انہی سے سن لیجئے گا۔"

"بات یہ ہے کہ سر انہوں نے نغمہ کو جس طرح جھڑکا' وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔" صائمہ بولی۔ "ورنہ میں جانتی ہوں کہ کھانے کے معاملے میں ان کی بات غلط نہیں تھی۔"

"وہ سب کو خطرے میں ڈال رہی تھی۔"

"پھر بھی آپ کو یہ حق نہیں تھا.........."

"اور اس وقت منتظم اعلیٰ بھی موجود نہیں تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی غلطی کی اور نہ ہی میں شرمندہ ہوں۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آیا۔

☆------------☆------------☆

اگلی صبح ہم مظفر آباد سے اٹھ مقام کے لئے روانہ ہوئے۔ نہ تو موسم دو سال پہلے جیسا تھا اور نہ ہی گاڑی خراب ہوئی۔ اور پھر بھی ہم لوگ آبشار پر رکے۔ اب وہ ہم لوگوں کے لئے ایک پکنک اسپاٹ بن چکا تھا۔ یہاں دو سال پہلے نعیم نے میری ایک یادگار تصویر بنائی تھی.......... اور چیلنج سے کہا تھا۔ "یہ تصویر دیکھیں گے تو آپ پھڑک جائیں گے۔" اور جب وہ تصویر سامنے آئی تو نعیم کا چیلنج دو نقطوں کے فرق سے ہار گیا۔ یعنی میں پھڑکنے کی بجائے بھڑکا اور بری طرح بھڑکا۔ جب کہ نعیم کے بیان کے مطابق وہ تصویر دیکھ کر شبنم کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ تصویر جو آبشار کا واضح منظر تھا۔ پیش منظر

میں' میں تھا اور شبنم میرے کندھے پر ٹھوڑی ٹکائے نیچے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز بڑا والہانہ تھا۔ مجھے یاد ہے جس وقت وہ تصویر لی گئی' شبنم مجھ سے خاصا اوپر ایک بڑے پتھر پر کھڑی تھی۔

اس یاد نے مجھے اداس کر دیا۔ طاہر مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "ظفر بھائی.......... پورے سفر میں' میں نے یہی دیکھا ہے کہ آپ بار بار کہیں کھو جاتے ہیں۔"

"ہاں.......... یادیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار۔ ان کے سحر سے نہیں بچا جا سکتا۔"

"کچھ دل کا بوجھ ہی ہلکا کر لیں۔"

"میں صرف خوشیاں شیئر کرنے کا قائل ہوں۔ دکھوں کو بے حد ذاتی چیز سمجھتا ہوں۔ ویسے بھی تمہیں اتنی فرصت کہاں۔"

طاہر جھینپ گیا۔ "اب ایسی بھی بات نہیں ظفر بھائی اور پھر ہم شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"اوہ.......... بہت تیز جا رہے ہو۔"

"ہم بہت خوش نصیب ہیں۔ دونوں کے پاس سچائی ہے۔ اس لئے یہ فیصلہ مشکل نہیں تھا۔"

مجھے لگا وہ مجھ پر طنز کر رہا ہے مگر مجھے برا نہیں لگا۔ "طاہر.......... میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ سب فضاؤں کا.......... اس بے پناہ حسن فطرت کا جادو ہے' جو آدمی کو محبت پر مجبور کرتا ہے۔ ایسے میں کسی کو کسی سے بھی محبت ہو جاتی ہے مگر کراچی کی بے رحم فضا میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔"

"ظفر بھائی.......... مائنڈ نہ کیجئے گا۔ آپ اپنے ناخوشگوار تجربے کی بنیاد پر ایک کلیہ بنا بیٹھے ہیں۔ یہ بہت منفی رویہ ہے۔ جب کہ آپ خود کہتے ہیں کہ انسان کو کلیوں کے حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایک ٹریجڈی کو آپ نے خود پر سوار کر لیا ہے۔ یہ آپ کی بڈلک تھی کہ وہ محترمہ آپ سے مخلص نہیں تھیں۔ وہ سچی ہوتیں تو آج آپ کا

نظریہ مختلف ہوتا۔"

"میں نے مائنڈ نہیں کیا طاہر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کلیوں والی بات سو فیصد درست ہے مگر پہاڑوں کا جادو بھی مسلمہ ہے۔ خیر جانے دو۔"

مجھے یہ بات چبھتی رہی.......... کیا شبنم سچی نہیں تھی.......... مخلص نہیں تھی؟ میرا خیال تھا کہ سفر کے دوران وہ بھی سچی تھی اور اس کا جذبہ محبت بھی' جو درحقیقت پہاڑ کا جادو تھا۔ میں نے آج تک اسے فلرٹ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ تصور میں نہیں کر سکتا تھا۔

مگر اب میں اس کے طرز عمل کا تجزیہ کرنے کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نعیم کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی کہ وہ اپنی منگنی سے خوش نہیں ہے۔ للذا منگنی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے یہ بھی جتایا کہ عقیدے کے معاملے میں وہ کٹر لوگ نہیں۔ یہ میری حوصلہ افزائی کے لئے' تھا ورنہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا ہوں۔ اس طرح اس نے مجھے ترغیب دی۔ یوں میں آگے بڑھا اور میں نے دلدل میں پاؤں رکھ دیا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں' پہاڑوں کا جادو میرے دماغ پر چھایا ہوا ہو اور وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھا رہی ہو۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر شبنم کا مقصد بس اچھا وقت گزارنا تھا۔

یہ بہت پیچیدہ سوال تھا۔ ایک کھلا ذہن ہی اس کا جواب دے سکتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس لئے مجھے اس سفر کے دوران ہی اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔

میں اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ نعیم اور سائرہ بھی آ گئے۔ طاہر پہلے سے موجود تھا۔ میں نے سائرہ اور نعیم کے انداز میں ہچکچاہٹ محسوس کی' جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔ "کیا بات ہے نعیم؟" میں نے کہا۔

"بھائی جان.......... یہ صائمہ مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔" نعیم نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس نے اچھا خاصا بڑا گروپ بنا لیا ہے۔ ہنگامے بازی کرے گی۔ جو لوگ انجوائے کر

رہے ہیں' ان کی تفریح خواہ مخواہ خراب ہو گی۔"

"تو سر ممنون سے بات کرو۔"

"اس کا کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔" سائرہ بولی۔

نعیم پھر ہچکچایا۔ "یہ مسئلہ آپ حل کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"صائمہ کا مسئلہ توجہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں' کل اس نے اس بات پر شکایت کی تھی کہ ہم نے اسے نظرانداز کیا تھا۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ طاہر بول پڑا۔ "نعیم ٹھیک کہہ رہا ہے ظفر بھائی۔ ہم اسے اپنے ساتھ شامل کر لیں تو شر خودبخود رفع ہو جائے گا۔"

"تو بھائی ایسا کر لو لیکن اس مسئلے سے یا اس کے حل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے کہا۔

"تعلق ہے ظفر بھائی۔" طاہر بولا۔ "وہ آپ سے بہت متاثر ہے۔ آپ سلیقے سے اسے ہینڈل کر لیں تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا۔" نعیم نے کہا۔

میں نے ان لوگوں کو غور سے دیکھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ تھے۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں پھر بھی مجھے غصہ آ گیا۔ "تو میں اس کے پاس جاؤں اور دست بستہ عرض کروں کہ محترمہ! آپ پرابلم چائلڈ ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنی توجہ سمیت آپ کے لئے حاضر ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" نعیم نے جلدی سے کہا۔ "یہ کام میں کر لوں گا۔ بس آپ اس کی حوصلہ شکنی نہ کیجئے گا۔"

"میں کسی جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

"پلیز بھائی جان' دوسروں کی تفریح غارت ہونے سے بچا لیں۔"

"اچھا.......... ٹھیک ہے۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اس بار سفر شروع ہوا تو سفیر شاہ نے نعیم کا دیا ہوا قومی نغموں کا کیسٹ لگا دیا۔ طاہر کھڑکی کے باہر کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تری وادی وادی گھوموں............ سن کر اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔ نغمہ ختم ہوا تو طاہر نے پھر مجھے دیکھا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا تھا ظفر بھائی۔ اب میں اس نغمے کو محسوس کر سکتا ہوں۔“

میں مسکرا دیا۔ ”آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

بس میں اب دل دل پاکستان گونج رہا تھا۔

☆===========☆===========☆

اٹھ مقام میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھے تھے کہ اچانک طاہر نے کہا۔ ”ظفر بھائی.......... تاش کا موڈ بن رہا ہے۔“

”تو کھیل لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کون کون کھیلے گا؟؟“

نعیم نے کہا۔ ”بھائی جان.......... بلا لاؤں صائمہ کو؟؟“

”اس کا بھروسا نہیں۔ کیوں اپنی عزت کے پیچھے پڑے ہو۔“

”خدمت خلق میں تو ایسا ہوتا ہے۔“

نعیم گیا اور دو منٹ بعد واپس آیا تو صائمہ اس کے ساتھ تھی۔ صائمہ نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ”جی فرمایئے؟“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے پیچھے کھڑا نعیم آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے اپیل کر رہا تھا۔ ”ہم لوگ تاش کھیلنے بیٹھ رہے تھے۔“ میں نے نرم لہجے میں صائمہ سے کہا۔ ”سوچا‘ آپ کو بھی پوچھ لیا جائے۔ بعد میں کہیں شکایت نہ ہو۔“

”شکریہ‘ میں ضرور کھیلوں گی۔“ وہ سامنے بیٹھ گئی۔

طاہر اپنے بیگ میں سے تاش کی گڈی نکال لایا۔ ”آؤ بھئی نعیم‘ تم میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔“

”مجھے سائرہ کو لے کر بازار جانا ہے طاہر بھائی۔“ نعیم نے معذرت کی پھر راحیلہ کی

طرف مڑا۔ ”راحیلہ........... آپ بیٹھ جائیں۔“

یوں تاش کی محفل جم گئی مگر میں وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔ یہ وہی کمرا تھا۔ ایسا ہی ایک دن تھا اور ایسی ہی تاش کی محفل تھی۔ میری پارٹنر شبنم تھی اور نعیم کے سامنے باقر بیٹھا تھا۔ وہ شبنم کے ساتھ میری پہلی قربت تھی۔ پچھلی رات کو ہی نعیم نے مجھے اس کا پیغام پہنچایا تھا۔

”آپ کا دھیان کھیل میں نہیں ہے۔“ صائمہ نے مجھے ٹوکا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر آپ کو پھول چلنا چاہیے تھا۔“

”مجھے احساس ہوا کہ صائمہ اچھا کھیلتی ہے........... سمجھ بوجھ کے ساتھ ورنہ عام طور پر لڑکیاں تاش بس اس طرح کھیلتی ہیں کہ رنگ سے رنگ ملاتی رہتی ہیں۔ ”سوری صائمہ۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا۔“ میں نے معذرت کی۔

کچھ دیر میں اچھی طرح کھیلتا رہا مگر پھر وقت پیچھے سرک گیا۔ آنکھوں کے سامنے لمس کے جگنو اڑنے لگے۔ پتے بانٹتے ہوئے شبنم پتے نیچے رکھنے کی بجائے میرے ہاتھوں میں دیتی تھی اور میں بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ ان موقعوں پر ہماری انگلیاں آپس میں ٹکراتی تھیں تو جیسے پورے جسم میں برقی رو دوڑ جاتی تھی۔ وہ ثانیوں کی چوری تھی‘ جو اگر کسی نے پکڑ بھی لی تھی تو ہمیں احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اڑتے جگنوؤں کے اس لمس کی لذت مجھے اب بھی یاد تھی۔

”پلیز........... آپ نے کوٹ مس کر دیا۔“ صائمہ نے پھر مجھے چونکا دیا۔ ”ذرا دھیان سے کھیلیں۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میری انگلیاں کیسے شل ہو رہی ہیں۔ میں نے کھیل پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی اور خاصی حد تک کامیاب رہا۔

اسی شام اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈھائی گھنٹے تاش کھیلنا بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ماحول میں بے حد خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

شام کو سب لوگ تفریح کے لئے قریبی چشمے پر چلے گئے۔ میں یہ سوچ کر رک گیا کہ کچھ کام کرلیا جائے لیکن ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ کام بھی نہیں کیا گیا۔ میں بیٹھا اس سوال کے بارے میں سوچتا رہا' جس کا جواب مجھے سفر ختم ہونے سے پہلے تلاش کرنا تھا۔ جو اذیت میں دو سال سے سہہ رہا تھا' اسے مزید آگے نہیں جانا چاہئے تھا۔ کوئی روگ بھی عمر بھر کا نہیں ہونا چاہئے۔ اب میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے پچھلی بار ٹوور پر نہ آ کر غلطی کی تھی۔ دکھ سے منہ چھپایا جائے تو وہ اور بڑا ہو جاتا ہے۔ دکھ سے تو لڑنا پڑتا ہے۔

سوال یہ تھا کہ کیا شبنم کے دل میں سفر کے دوران جاگنے والا جذبہ سچا تھا.......... یا وقتی تھا۔ یہی نہیں' مجھے خود کو بھی ٹٹولنا تھا۔ یہی سوال اپنے بارے میں بھی کرنا تھا۔ یہ بھی سوچنا تھا کہ اب مجھے دکھ کس بات کا ہے۔ شبنم کے کھونے کا.......... یا اس بات کا کہ اس نے مجھے بے وقوف بنا دیا.......... یا اس بات کا کہ وہ مجھ سے محبت کی حد تک متاثر ہوئی مگر سفر تمام ہوتے ہی.......... حقیقی زندگی میں پہنچتے ہی میرا تاثر زائل ہو گیا۔ اس کے نزدیک میں بے وقعت ہو گیا۔ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ انا بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ اس کے مجروح ہونے کا دکھ آدمی خود سے بھی چھپاتا رہتا ہے لیکن اس سے بچ بھی نہیں سکتا۔

میں ان سوچوں میں گم تھا کہ صائمہ چلی آئی۔ اسے موجود پا کر مجھے جھٹکا لگا۔

"ارے.......... آپ گئی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کزن ندیم کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس لئے میں رک گئی۔" صائمہ نے کہا پھر پوچھا۔ "آپ کیوں نہیں گئے؟"

"میں نے سوچا' کچھ کام کرلوں گا۔"

"لیکن کام سے تو بہت دور نظر آرہے ہیں آپ۔ کسی سوچ میں گم ہیں۔"

سچ تو کڑوا ہی لگتا ہے۔ میں چڑ گیا۔ "میرا کام سوچنے ہی کا ہے۔"

وہ لاجواب ہو گئی۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" چند لمحے کے توقف کے

بعد اس نے کہا۔ "دوا چاہئے ندیم کے لئے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے۔"

"چلئے.......... میں چلتا ہوں۔ حال پوچھ لوں پھر دوا دے دوں گا۔"

میں نے جا کر ندیم سے پوچھا پھر اسے ہومیوپیتھک دوا کی ایک خوراک دے دی۔ اس سے خاصا فرق پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد دوسری خوراک دی تو وہ سکون سے سو گیا۔ "اب آپ بے فکر ہو جائیں۔" میں نے صائمہ سے کہا۔ "اسے سونے دیں۔ یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔"

اس نے ممنونیت سے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی۔ "اب کمرے میں کیا جائیں گے۔ آئیے.......... لان میں بیٹھیں۔"

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ ہم دونوں لان میں جا بیٹھے۔ پہلی بار ہم دونوں کے درمیان ذاتی گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا اور اس نے مجھے اپنے بارے میں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بی ایس سی فائنل میں پڑھ رہی ہے۔ ارضیات اس کا خاص مضمون تھا۔ والد کا اپنا کاروبار تھا۔ وہ کافی خوش حال لوگ تھے۔ نارتھ ناظم آباد' بلاک ڈی میں ان کا اپنا مکان تھا۔

"ایک پرسنل سوال کروں آپ سے؟" اچانک صائمہ نے کہا۔

"نہ کریں تو بہتر ہے۔ اس لئے کہ ضروری نہیں' میں جواب دے ہی دوں۔"

"کیوں؟"

"میں سب سے گھل مل جاتا ہوں۔ مگر پرسنل تو میں قریبی لوگوں کو بھی نہیں ہونے دیتا۔"

"بہت اچھی بات ہے یہ۔ میں بھی ایسی ہی ہوں مگر میں سوال پھر بھی کروں گی۔"

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اچانک بولی۔ "کوئی چوٹ کھا چکے ہیں آپ؟"

میں سناٹے میں آ گیا۔ پھر مجھے غصہ آ گیا۔ "اگر ایسا ہوا بھی ہے تو آپ کو کیوں بتاؤں میں؟ آپ کون ہیں؟ خود آپ نے کہا تھا کہ بیس دن کا ساتھ ہے صرف اور کراچی پہنچ کر سب اجنبی کے اجنبی۔ میں بھی اسی لئے تعلقات زیادہ نہیں بڑھاتا۔"

"میں نے کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔" اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ "اور اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بتا دیں۔ آپ جیسے لوگ قریبی لوگوں کو تو کچھ نہیں بتاتے۔ میں اجنبی ہوں اور اس سفر کے بعد شاید کبھی ہمارا سامنا بھی نہیں ہو گا۔ لہٰذا آپ کو ہلکے پن کا احساس بھی نہیں ہو گا۔"

"شکریہ۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"نہ بتائیں۔ لیکن میں یقین سے کہتی ہوں کہ آپ نے چوٹ کھائی ہے اور وہ بہت بدنصیب لڑکی تھی' جس نے موقع ملنے کے باوجود آپ کو گنوا دیا۔ لیکن غلطی آپ کی بھی ہے۔ سبھی کچھ کسی ایک شخص سے وابستہ نہیں کرنا چاہئے.......... کم از کم اس وقت تک نہیں' جب تک اس شخص کو خوب پرکھ نہ لیا جائے۔"

"اور پرکھنے کے لئے عمر بھی کم ہے۔" میں نے طنز میں کہا۔

"بے شک۔ لیکن کبھی ایک نظر میں بھی آدمی کو پرکھ لیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ محبت کی رنگین عینک نہ ہو آنکھوں پر۔"

"تم محبت کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" میں بری طرح چڑ گیا۔

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں جانتی۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "اسی لئے تو لوگوں کو سمجھ سکتی ہوں۔ اور ہو سکتا ہے' دو ایک دن میں محبت کے بارے میں بھی جان لوں۔" اسی وقت سب لوگ آ گئے اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اگلے روز ہم لوگ اٹھ مقام سے اوپر روانہ ہوئے۔ حسین بخش اور حمید کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ ہماری واپسی ڈیڑھ بجے تک ہو جائے گی۔ کھانا تیار ملنا چاہئے۔

اٹھ مقام سے آگے کیرون ہے.......... اور شاردا اور کیل ہے۔ یہ سب وادی نیلم کا حصہ ہے۔ کیل آزاد کشمیر کا آخری مقام ہے۔ سری نگر وہاں سے زیادہ دور نہیں۔ مجھے ہمیشہ شوق رہا کہ میں کیل تک جاؤں۔ وہاں کی جھیل کی بڑی تعریف سنی ہے۔ لیکن یہ شوق پورا نہیں ہوا۔ اب انشاء اللہ کشمیر کی آزادی کے بعد ہی پورا ہو گا۔ فی الحال تو

صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء سے تو اٹھ مقام جانا بھی ممکن نہیں رہا۔ اٹھ مقام سے مقامی آبادی کا بھی انخلا کرا لیا گیا تھا۔

ہم لوگ کیرن تک گئے۔ کیرن کا ریسٹ ہاؤس بہت خوبصورت ہے۔ کافی بڑا لان' جس میں جا بجا چیری کے درخت لگے ہیں۔ عقب میں ریلنگ لگی ہے۔ نیچے دریائے نیلم بہہ رہا ہے اور دریا کے پار مقبوضہ کشمیر ہے۔ بھارتی ظلم و ستم نے ہزاروں مسلمانوں کو دریا پار کر کے پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔

چوکیدار موجود نہیں تھا لہٰذا کمرے نہ مل سکے۔ البتہ لوگوں نے چیریاں جی بھر کے کھائیں۔ اس کے بعد کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ کچھ لڑکے اپنی دوربین کی مدد سے مقبوضہ کشمیر میں جھانکنا چاہتے تھے لیکن سر ممنون نے سختی سے منع کر دیا کہ جواب میں فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔

اس موقعے پر کچھ لوگوں کی طرف سے وہ مشہور جملہ بھی سننے میں آیا' جو سر ممنون ہر سال کسی نہ کسی کے منہ سے ضرور سنتے ہیں۔ "سر.......... یہاں ہمیں کیوں لے آئے ہیں آپ' یہ تو ویسے ہی پہاڑ ہیں۔ اس سے تو اچھا مری تھا۔"

سر ممنون ان لوگوں کو بھگت رہے تھے کہ میں نے ان سے اجازت چاہی۔ "سر.......... اجازت ہو تو ہم لوگ ہائیکنگ پر نکل جائیں؟" ریسٹ ہاؤس کے مقابل پہاڑ کے اوپر ایک گاؤں تھا۔ میں نے سوچا تھا' وہاں تک ہو کر آئیں گے۔

سر ممنون نے پوچھا۔ "کون کون جا رہا ہے بھئی؟"

"نعیم' طاہر' امجد' صائمہ' رخسانہ' ناہید' راحیلہ اور چند چھوٹے لڑکے سامنے آئے۔ سر ممنون نے مجھ سے کہا۔ "یہ لوگ تمہاری ذمے داری ہیں ظفر' اور یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ ہم ایک بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

"او کے سر۔"

ہم لوگ چل دیئے۔ راستہ ہماری توقع سے زیادہ خطرناک تھا اور فاصلہ بھی کم نہیں تھا۔ بل کھاتی پہاڑی پگڈنڈیوں پر چڑھنا اترنے کی نسبت آسان ہوتا ہے لیکن یہاں

چڑھائی کچھ زیادہ ہی عمودی تھی۔ چھوٹے لڑکوں نے اس پر کچی سڑک کو ترجیح دی مگر اس طرح فاصلہ زیادہ ہو جاتا ہے' اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ پہاڑی پگڈنڈیاں زبردست شارٹ ثابت ہوتی ہیں۔

پہلی ہی چڑھائی پر گڑبڑ ہو گئی۔ نعیم کے ساتھ اس کی تین سالہ بھتیجی طوبیٰ بھی تھی اور وہ اسے گود میں لئے چڑھ رہا تھا۔ ایک موقعے پر اس کا پاؤں پھسل گیا۔ طاہر نے اس کا ہاتھ نہ تھام لیا ہوتا تو وہ بھتیجی سمیت کم از کم سو فٹ نیچے چلا جاتا۔ "نعیم.......... تم واپس ہی چلے جاؤ۔ آگے چڑھائی زیادہ ہے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"نعیم کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بہتری اسی میں تھی۔ چنانچہ وہ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد راحیلہ کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک تو وہ سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ دوسرے پہاڑی راستوں پر پہلی بار چل رہی تھی۔ وہ ڈر بھی رہی تھی اور اس کی سانس بھی اکھڑ رہی تھی۔ اوپر سڑک پر پہنچ کر وہ بیٹھ گئی۔ "مجھ سے تو نہیں چلا جاتا۔" وہ منمنائی۔ "میں واپس جاؤں گی۔"

طاہر نے پرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے لیکن اب اس سڑک سے جانا.........."

"اکیلی جاؤں گی میں؟" راحیلہ نے فریاد کرنے والے لہجے میں کہا۔ "بھٹک گئی تو۔"

طاہر نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "بری بات ہے طاہر۔" میں نے کہا۔ "تم راحیلہ کے ساتھ جاؤ۔"

"لیکن ظفر بھائی.......... میں ہائیکنگ.........."

"اس کے موقعے بعد میں بھی مل جائیں گے۔ اس وقت تم راحیلہ کو واپس لے جاؤ۔"

ان کے جانے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ اب ہم صرف پانچ افراد رہ گئے تھے۔ صائمہ' رخسانہ' ناہید' امجد اور میں۔ اگلی چڑھائی عبور کرتے کرتے ہم سب ہانپ

چکے تھے۔ چنانچہ ہم سانس درست کرنے بیٹھ گئے۔ اچانک پیچھے نظر پڑی تو کافی نیچے سڑک پر چھوٹے لڑکے بیٹھے ستاتے نظر آئے۔ انہوں نے ہمیں اتنا اوپر دیکھا تو شاید انہیں اندازہ ہوا کہ سڑک پر پیدل سفر کرنا بہت لمبا ثابت ہو گا۔ ان کے حوصلے جواب دے گئے۔ ایک لڑکے نے چیخ کر مجھے مطلع کیا کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔

ہم نے سفر شروع کیا۔ ہم میں سب سے ایزی صائمہ تھی۔ اس کے جاگرز اور اونچی شلوار اس وقت بہت کام آ رہے تھے۔

ہم راستے میں تین مرتبہ اور رکے۔ میرے لئے تو اسموکر ہونے کی وجہ سے دشواری ہو رہی تھی۔ رخسانہ اور ناہید بہت ہمت سے کام لے رہی تھیں۔ تیسری بار ہم رکے تو امجد کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے کہا۔ "واپسی میں مجھے یہاں سے ساتھ لے لیجئے گا۔ اب میں اور آگے نہیں جا سکتا۔"

ہم سب کا پیاس سے برا حال تھا۔ مزید آدھا گھنٹا چلنے کے بعد ہم گاؤں پہنچ گئے۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گھر کافی فاصلے پر تھے۔ اردگرد چاولوں کے کھیت تھے۔ ہم آگے کے بجائے پہلے کچے مکان کے سامنے رک گئے۔ میں نے کہا۔ "پیاس بہت لگ رہی ہے۔ تم اس گھر سے پانی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔" یہ کہہ کر میں چنار کے گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ دھوپ کی تمازت کی جگہ خنکی نے لے لی۔ گرمی کا احساس بھی نہیں رہا۔

لڑکیوں کو گھر میں داخل ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں نے دروازے پر جا کر ناہید کو آواز دی۔ صائمہ دروازے پر آئی۔ "تم لوگ تو اندر بیٹھ ہی گئیں جم کر۔" میں نے کہا۔

"بہت مہمان نواز لوگ ہیں۔" صائمہ نے پانی کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"کہتے ہیں' ایسے نہیں جانے دیں گے۔ روٹی پکا رہی ہیں۔"

"ان سے کہو' ہمیں فوراً واپس جانا ہے۔"

"میں بتا رہی ہوں' یہ ممکن نہیں ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں ورنہ اس وقت آپ بھی اندر ہی بیٹھے ہوتے۔"

میں پھر درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ کوئی بیس منٹ بعد صائمہ ایک تھالی لئے باہر آئی اور درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ "لیجئے.......... کھائیے۔"

"ایک موٹی تندوری روٹی تھی' جس پر نرم ملائم مکھن کا ایک پیڑا رکھا تھا۔ ایک طشتری میں ساگ تھا۔ جگ میں کچے دودھ کی پھیکی لسی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ میں نے کھانا شروع کر دیا۔

صائمہ بیٹھی مجھے تکتی رہی۔ میں دانستہ نظریں اٹھانے سے گریز کر رہا تھا۔ اچانک وہ بولی۔ "مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ بعد میں تو شاید موقع ہی نہیں ملے گا۔"

میری دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ تاہم میں خاموش رہا۔

"آپ نے جو یہ اچانک مجھے منہ لگانا شروع کیا ہے تو ایسا رفع شر کے لئے ہے نا؟"

میں بوکھلا گیا۔ میں نے لسی کا گھونٹ لے کر نوالہ حلق میں اتارا۔ "یہ منہ لگانے والی بات غلط بھی ہے اور سخت بھی۔ اور پھر شر کیسا اور رفع شر کیسا؟"

"میں تو جانتی ہوں نا کہ میں خود کو کیا ثابت کر رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔ "لیکن مجبوری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اب مجھ پر عنایات کی ضرورت نہیں۔ میں ویسے ہی وعدہ کرتی ہوں کہ اب میری وجہ سے کوئی ہنگامہ نہیں ہو گا۔ کسی کی تفریح خراب نہیں ہو گی۔ کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔"

خفت سے میرا چہرہ تمتما اٹھا۔

"یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں گروہ کی نفسیات کو سمجھتی ہوں۔" اب اس کا لہجہ نرم تھا۔ "ہم نیچے پہنچیں گے تو جانے کتنے جملوں' کتنی نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر آپ کی عنایات جاری رہیں تو یہ سلسلہ کراچی پہنچنے تک چلتا رہے گا۔ میں کوئی اسکینڈل نہیں چاہتی۔" یہ کہہ کر اس نے برتن اٹھائے اور اندر چلی گئی۔

میرا دماغ سائیں سائیں کرتا رہا۔

ہم ایک بجے گاؤں سے چلے۔ "آنے میں دو گھنٹے لگے تھے۔" رخسانہ بڑبڑائی۔ "نیچے پہنچتے پہنچتے تین بج جائیں گے۔ سر نے کہا تھا.........."

"اترنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "اور ہاں.......... اب سڑک سڑک چلیں گے۔"

ہم ڈیڑھ بجے نیچے پہنچے تو سرمنون کی وسل کی آواز کوڑے کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سرمنون ہی نہیں' بہت لوگ ہم سے خفا ہیں۔

☆============☆===========☆

ہم اٹھ مقام سے روانہ ہو رہے تھے۔ بس ہوٹل کے سامنے رکی۔ منور تھرموس لئے کھڑا تھا۔ ہم اتر کر اس سے گلے ملے۔ اس نے تھرموس میری طرف بڑھا دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس نے رخصت ہونے سے پہلے ہمیں کشمیری چائے کا تحفہ دیا۔ "فی امان اللہ صاحب۔ شاید آئندہ سال آپ یہاں نہ آ سکیں۔" اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ "اور شاید ہم بھی یہاں موجود نہ ہوں۔ کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔"

میرا دل بھر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم اداس ماحول میں اٹھ مقام سے رخصت ہو رہے تھے۔

مظفر آباد سے نکلتے ہوئے ہم نے آم خریدے۔ میں نے طاہر سے کہا۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آم کھانے میں تمہیں ایسا لطف کبھی نہیں آیا ہو گا' جیسا اب آئے گا۔"

طاہر نے کندھے جھٹک دیئے۔ "آم کھانے میں ہر حال میں لطف آتا ہے۔"

"پروگرام کے مطابق دوپہر کے کھانے کے لئے گڑھی حبیب اللہ کے باہر دریائے کنہار کے کنارے گاڑی روکی گئی۔ یہ بھی بہت اچھا پکنک اسپاٹ تھا۔ دریا کنارے ذرا فاصلے پر درختوں کی طویل قطار تھی۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔

کچھ لڑکے کنارے پر نہانے لگے۔ سرمنون نے انہیں سمجھایا کہ اندر نہ جائیں۔

کنارے پر ہی نہاتے رہیں۔ ہم نے آموں کی تھیلیاں' منہ پر گرہ لگا کر پانی میں چھوڑ دیں۔

میں نے طاہر سے کہا۔ "بہتر ہے کہ کنہار میں نہالو۔ کراچی پہنچ کر اس بات پر اکڑ سکو گے۔"

"یہ کنہار ہے۔" طاہر نے حقارت سے کہا۔ "میں نے تو اس کے بارے میں بہت افسانے سنے تھے۔"

میں ہنسنے لگا۔ "اس مسافر کا تصور کرو' جس نے طویل اور بے حد کٹھن مسافتیں جھیلی ہوں اور راستے میں کہیں ستانے تک کے لئے نہ رکا ہو۔ اس مسافر کا منزل پر پہنچنے پر کیا حال ہو گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بعد میں سمجھو گے' ابھی نہیں۔ فی الحال تم تھکے ہارے خوابیدہ کنہار کو تسخیر کرلو۔"

ہم سبھی نہانے لگے۔ طاہر کہنے لگا۔ "پانی بہت ٹھنڈا ہے۔"

"پانی ٹھنڈا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کنہار کا ٹھنڈا پانی تم نے ابھی دیکھا نہیں ہے۔"

سر ممنون نے بریانی اٹھ مقام میں صبح ہی تیار کرا لی تھی۔ حسین بخش نے چاول گرم کئے۔ سر ممنون نے سب کو آواز دی کہ کھانا تیار ہے۔

کھانے کے بعد سائرہ نے آم کاٹے۔ کنہار کے پانی میں پڑے ہوئے آم برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ لطف آ گیا۔ "سچ ہے کہ آم کھانے کا ایسا لطف پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔" طاہر نے اعتراف کیا۔

کھانے کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ اب ہماری منزل ایبٹ آباد تھی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر3' گامی اڈا۔ فوج کا شہر ایبٹ آباد' فوجیوں کی سب سے اچھی تربیت گاہ' جہاں پاکستان ملٹری اکیڈمی بھی ہے اور برن ہال کالج بھی۔

ہم سامان رکھوانے کے بعد سکول سے نکلے۔ پہلا کام ہوٹل میں کمرے لینا تھا۔

سکول کے سامنے ہی ایشیا ہوٹل اور ماؤنٹ ویو ہوٹل ہیں۔ طاہر کو وہ پسند آ گئے۔ ہم اندر گئے اور کمروں کے لئے پوچھا۔ کلرک نے بتایا۔ "ڈبل بیڈ سو روپے یومیہ۔"

"کرایہ تو بہت معقول ہے۔" طاہر نے کہا۔

"پانی کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے کلرک سے پوچھا۔

"دو بالٹی پانی ملے گی۔" کلرک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ایک بالٹی صبح' ایک شام۔"

طاہر یہ سن کر بری طرح بدکا۔ "کیا مطلب؟ یہاں بھی پانی کی قلت ہے؟"

"سر جی......... پانی کا یہاں بڑا مسئلہ ہے۔ گرمیوں میں تو خاص کر بہت قلت ہو جاتی ہے۔ اب آپ کہیں تو کمرے دکھادوں؟"

طاہر نے میری طرف دیکھا۔ "کوئی ایسا ہوٹل نہیں' جہاں یہ مسئلہ نہ ہو؟"

"ہے کیوں نہیں۔ چلو' دیکھ لو۔"

"بالآخر ہم نے فیصل ہوٹل میں دو کمرے لے لئے۔ نہا دھو کر کپڑے بدل کر تازہ دم ہو کر ہم واپس سکول پہنچے۔ وہاں کرکٹ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میدان کافی بڑا اور اچھا تھا۔ ٹوور کے دوران پہلا موقع تھا کہ کرکٹ کا سامان نکالا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہونے تک کرکٹ کھیلی جاتی رہی پھر ہم اپنے بیگ لے کر ہوٹل چلے آئے۔ "یہ صائمہ کا کیا معاملہ ہے ظفر بھائی؟" طاہر نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"نعیم نے اس سے تاش کھیلنے کا پوچھا تو کہنے لگی' میرا موڈ نہیں ہے۔"

"تم لوگوں نے میری بڑی بے عزتی کرائی ہے۔" میں پھٹ پڑا۔ پھر میں نے گزشتہ روز کی گفتگو دہرائی۔ "وہ جانتی تھی کہ ہم اسے رام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑی گھاگ لڑکی ہے وہ۔"

"خیر گھاگ تو نہ کہیں۔ یہ بہت برا لفظ ہے۔ ہاں وہ سمجھدار بہت ہے۔" طاہر نے کہا۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے وعدے کے مطابق کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ دونوں کے متعلق باتیں شروع ہو گئی تھیں' جو اب سرد پڑ رہی ہیں۔"

"مجھے کیا؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ "میں تو یوں بھی ایسے کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

رات آٹھ بجے ہم کھانا کھانے سکول گئے۔ کھانا ابھی تیار نہیں تھا۔ میدان کے باہر چبوترہ اور اس سے ادھر لان تھا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ہم بھی اس طرف چل دیئے۔ وہاں انیس صاحب' شمس صاحب' اختر صاحب' مس نائلہ' مس راشدہ' صائمہ' سائرہ اور ملک صاحب بیٹھے تھے۔ شمس صاحب نے مجھے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "بھئی بڑے موقعے سے آئے ہو۔"

ہم لوگ بھی وہاں جا بیٹھے۔ میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے۔ میری یاد کیسے آ گئی؟"

"بھئی چاندنی رات ہے۔" اختر صاحب بولے۔ "ہم سوچ رہے تھے کہ یادیں ہی تازہ کرلیں کچھ۔"

"ضرور کریں۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ میں تو یادوں سے بھاگتا اور ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا پھر رہا ہوں۔

"تو کوئی غزل سنا دو جلدی سے۔" انیس صاحب نے کہا۔

"اس وقت تو........"

سائرہ نے میری بات کاٹ دی۔ "غزل تو سنانی پڑے گی بھائی جان........ اور وہ بھی ترنم سے۔ وہی سنا دیں........ تو پنچھی میں تیرا ٹھکانا........"

"یہ غزل تو مجھے یاد نہیں۔" میں نے کہا۔ حالانکہ اس غزل کو میں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ دو سال پہلے اسی سفر کے دوران کہی تھی اور پہلی بار اسی جگہ بیٹھ کر سنائی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اس وقت شبنم بھی میرے سامنے بیٹھی تھی اور یہ فرق بہت بڑا تھا۔

"پھر بھی دو ایک شعر تو یاد ہوں گے۔ سنا دیں نا" سائرہ گھگیانے لگی۔ "دو سال پہلے ہی تو آپ نے سنائی تھی۔"

سب کے اصرار کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں نے ترنم سے غزل شروع کی۔

تُو پنچھی میں تیرا ٹھکانا میں ہی ترے سپنوں کا نگر
شام ہوئی اندھیارے گونجے' آ اب رین بسیرا کر
راہ کٹھن ہے دھوپ کڑی ہے' تُو لیکن کچھ فکر نہ کر
میں جو شجر ہوں نام کا تیرے' میں جو ہوں تیرا زادِ سفر
میں تجھ سے ہوں تُو مجھ سے ہے' باقی سب کچھ دھوکا ہے
پھول ہے تُو میں خوشبو' میں ہوں دعا تُو میرا اثر
تجھ سے بچھڑ کر مجھ کو فنا ہے کیسے بھلا تشریح کروں
وقت ہے تُو میں ایک لمحہ ہوں' لہر ہوں میں تو ہے ساگر
بجھتے سے ہی شام اور سورج کتنے سندر لگتے ہیں
جیسے راکھ برستی جائے دہکے ہوئے انگاروں پر

مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ غزل پڑھتے ہوئے شبنم کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کس نے مجھے داد دی اور کس نے نہیں دی۔

"یہ تو ہوا دو سال پرانا کلام" انیس صاحب نے مجھے چونکا دیا۔ "اب ہو جائے کوئی تازہ غزل کوئی ایسی غزل جو اس سفر کے دوران ہوئی ہو۔"

میں نے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن جان نہیں چھوٹی۔ مجھے تازہ غزل سنانا ہی پڑی۔

جانے کس بزم تک گئیں آنکھیں
بیٹھے بیٹھے چھلک گئیں آنکھیں
اس کو ہم پر ہوا کسی کا گماں
پاؤں ٹھٹکے چمک گئیں آنکھیں

سامنے کی حقیقتیں نہ ملیں
گو بہت دور تک گئیں آنکھیں
تابہ کے ایک چہرہ ' ایک بدن
عین فطرت کہ تھک گئیں آنکھیں
پورا منظر بدل گیا لوگو
لمحہ بھر کو جھپک گئیں آنکھیں

سرممنون نے کھانے کے لئے نہ پکار لیا ہوتا تو اب بھی میری جان نہ چھوٹتی۔ سب لوگ کھانے کے لئے اٹھ گئے۔ میں پیچھے تھا۔ صائمہ میرے ساتھ تھی۔ اچانک اس نے پوچھا۔ "آپ کی قریب کی نظر کمزور ہے؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "جی ہاں۔ میں ریڈنگ گلاسز استعمال کرتا ہوں لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

وہ مسکرائی۔ "آپ کی غزل سے اور یہ نظر دو سال کے اندر کمزور ہوئی ہے۔ دو سال پہلے تک ٹھیک تھی نا؟"

"جی ہاں۔" میں حیران تھا۔

"اور دور کی نظر آپ کی بہت اچھی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یہ میرا مشاہدہ ہے۔" وہ بولی۔ "ایک مشورہ ہے۔ چشمے کو صرف پڑھنے لکھنے تک محدود نہ کریں۔ ہر وقت لگائے رکھا کریں۔ نظروں کے بہت قریب بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے آگے چلی گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

☆===========☆===========☆

اگلے روز پارٹی کے کئی پروگرام تھے۔ شملہ پہاڑی پھر پی ایم اے کاکول' پھر ٹھنڈیانی اور آخر میں جھگیاں' شملہ پہاڑی ایبٹ آباد میں ایک تفریحی مقام ہے۔ پی ایم اے ملٹری اکیڈمی ہے' جہاں کے لئے خصوصی اجازت لی گئی تھی۔ ٹھنڈیانی ایبٹ آباد سے ۲۵ کلومیٹر دور تفریح گاہ ہے' جو سطح سمندر سے ساڑھے آٹھ ہزار فٹ بلند ہے اور جھگیاں ایبٹ آباد کا باڑہ ہے۔

میں کام کی نیت سے ہوٹل میں ہی رک گیا۔ یہ تمام مقامات میرے کئی بار کے دیکھے ہوئے تھے۔ کچھ باہر جانے کا موڈ بھی نہیں بن رہا تھا۔

لیکن ایک بار پھر مجھ سے کام نہیں کیا گیا۔ اس بار میں جھنجلا گیا۔ یہ سب یادوں کے آسیب کی فتنہ گری تھی۔ آسیب سے ایک بار جان چھڑا لینا ہی بہتر تھا۔ یہ ضروری تھا کہ نظریں چرانے کی بجائے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا جائے۔ بہتر تھا کہ میں وہ سب کچھ دہرالوں اور سمجھنے کی کوشش کروں کہ وہ سب کیا تھا' جو گزر گیا اور یہ بھی کہ مجھے زخم کس نوعیت کا لگا تھا۔ کیونکہ کوئی زخم بھی ہمیشہ ہرا نہیں رہتا۔ ہر زخم کو مندمل ہونا ہوتا ہے۔ مجھے خود کو یہ بھی سمجھانا تھا کہ جو گزر گیا' وہ پلٹ کر نہیں آئے گا اور زندگی بھر ایک بے مقصد روگ کو سینے سے لگائے رکھنا حماقت ہے۔

دو سال پہلے اٹھ مقام میں جو کھیل انگلیوں کے لمس سے شروع ہوا تھا' وہ بڑھتے بڑھتے لفظوں تک آپہنچا تھا۔ حجاب اٹھ گیا تھا لیکن لمس کا سفر بہرحال آگے نہیں بڑھا تھا۔ ہم لوگ بارہا تنہائی میں ملتے رہے تھے۔ کبھی کبھی شبنم کی نظریں عجیب سی ہو جاتیں' ہاتھوں میں لرزش سما جاتی اور آواز بکھرنے لگتی لیکن میں اس تبدیلی کا مفہوم کبھی نہ سمجھ

سکا۔

مجھے اسلام آباد کے اسکاؤٹس نیشنل ہیڈکوارٹرز کی آخری بات یاد آئی۔ اس رات نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کمرے میں جا کر سونے کی بجائے پورٹیکو میں چلا آیا اور ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ جدائی کی رات تھی۔ اگلے روز ہم کراچی کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو اب یاد نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ میرا ذہن خدشات میں گھرا ہوا تھا۔ کوئی انجانی حس مجھے بتا رہی تھی کہ کراچی پہنچ کر میں شبنم سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔

مجھے وہاں پاؤں پھیلا کر بیٹھے جیسے صدیاں گزر گئی تھیں۔ اچانک میں نے لان کے سائیڈ ڈور سے چار ہیولوں کو برآمد ہوتے دیکھا۔ شبنم کو میں نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ اس کے ساتھ افشاں تھی اور دو لڑکے تھے۔ وہ لوگ ٹہلتے ہوئے آئے اور ٹہلتے ہوئے پھر اندر چلے گئے۔ ان کے درمیان دھیمی آواز میں کچھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ آئے۔ اب تک انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ پورٹیکو کی تمام بتیاں گل تھیں۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا دو بجے تھے۔

تیسری بار وہ آئے تو میری چھینک نے میری موجودگی کا راز فاش کر دیا۔ شبنم میری طرف چلی آئی۔ "کون.........؟ ظفر آپ۔"

"ہاں۔ میں ہی ہوں۔"

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں۔ نیند نہیں آ رہی۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ تم لوگ رات کے دو بجے چہل قدمی کیوں کر رہے ہو۔ یہ لڑکے کون ہیں؟"

"سلمان اور رشید ہیں۔" وہ بولی "ٹھہریں......... میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ گئی۔ چند لمحے ان تینوں سے باتیں کرتی رہی پھر میری طرف چلی آئی۔ وہ تینوں اندر چلے گئے۔ شبنم میرے قریب آ بیٹھی۔ اس نے ٹانگیں باہر لٹکائی ہوئی تھیں۔ "اب

بتائیں........."

"نہیں، پہلے تم بتاؤ۔ تم جانتی ہو کہ سر ممنون کتنے سخت ہیں پھر تم ان لڑکوں کے ساتھ اتنی رات کو کیوں چہل قدمی کر رہی ہو؟"

"وہ......... وہ تو بچے ہیں" اس نے ناراضی سے کہا۔ "اور ہمیں نیند نہ آنے کی ایک معقول وجہ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی نہیں۔ میرے اور افشاں کے پاس پیسے بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ سفر کے دوران کیسے کام چلے گا۔"

"یہ بات تمہیں مجھ کو بتانی چاہئے تھی"

"شرم آتی تھی۔"

"مجھ سے؟ بہرحال اب جاؤ۔ افشاں کو بھی سمجھا دو اور سکون سے سو جاؤ۔ صبح مجھ سے پانچ سو لے لینا۔"

"اور آپ؟ آپ یہیں بیٹھے رہیں گے؟"

"ہاں۔ نیند ہی نہیں آ رہی ہے"

وہ چلی گئی مگر پانچ منٹ بعد چائے کا تھرموس اور دو مگ لئے چلی آئی۔ "میں نے سوچا، چائے ہی بنا لوں آپ کے لئے۔ نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی ہے۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ہم دونوں چائے پیتے رہے "کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"اداس ہیں؟"

میں نے مگ خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ "شبنم......... مجھے لگتا ہے کہ آج کے بعد ہم نہیں مل سکیں گے" میں نے کہا۔ "کراچی پہنچ کر فاصلے بہت بڑھ جائیں گے۔"

"خوامخواہ ڈرتے ہیں۔ میرا فون نمبر اور پتا آپ کے پاس ہوگا اور آپ کا میرے پاس۔ فاصلوں سے کیا ڈرنا۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میں دل کا کیا کروں۔ وسوسے ہی وسوسے ہیں یہاں۔"

"سب کچھ بھول جائیں۔" اس کی آواز بھی اس کے ہاتھ کی طرح لرزنے لگی۔

"صرف یہ یاد رکھیں کہ اس وقت میں آپ کے پاس ہوں......... آپ کے بے حد قریب۔" اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔

وہ میرے لئے بہت کڑا وقت تھا۔ جب دل کسی کے بچھڑنے......... کھو جانے کے خوف کے بوجھ سے لرز رہا ہو تو آدمی اور کمزور ہو جاتا ہے۔ ویسے تو تنہائی اور اندھیرا ہی بہت بڑی ترغیب تھا۔ مگر مجھے فخر ہے کہ میں اس وقت کو بغیر شرمندگی کمائے جھیل گیا۔

ہم یونہی بیٹھے رہے۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا سر میرے کندھے پر اور میری انگلیاں اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔

گھنٹوں گزر گئے۔ پانچ بجے میں نے اسے پانچ سو روپے دیئے۔ "اب تم جاؤ شبنم۔"

اس کے جانے کے بعد میں بھی وہیں بیٹھا رہا۔

پھر سفر شروع ہوا۔ واپسی کا سفر۔ اس پورے سفر میں اس کے اور میرے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ واضح طور پر مجھ سے کترا رہی تھی۔ ایک بار موقع نکال کر میں نے اس سے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے تو اس نے کہا کہ وہ افشاں کو لگائی بجھائی کر کے معاملہ خراب کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔ میری تسلی تو نہیں ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔

۳۸ گھنٹے کے اذیت ناک سفر کے بعد ہم کراچی پہنچ گئے۔

شبنم کی ہر یاد کو میں نے بارہا تازہ کیا تھا۔ مگر کراچی والا حصہ ایسا تھا' جسے میں نے کبھی یاد نہیں کیا بلکہ اسے یاد کرنے سے ڈرتا رہا۔ میں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟ اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے ضروری تھا۔ کہ میں ان یادوں سے گزروں۔

یہ خیال آتے ہی میرے اندر ایک مزاحمت ابھری......... ایک خوف امنڈا' جیسے کوئی کسی آسیب زدہ اور تاریک مکان میں گھسنے سے ڈرے۔ میں ذہنی طور پر پسپا ہونے لگا۔ مگر پھر میں نے دل کڑا کر لیا۔ اس طلسم کدے میں ایک بار تو گھسنا ہی ہے۔

پہلے تو مجھے یوں لگا جیسے میں وہ سب کچھ بھول چکا ہوں مگر پھر سب کچھ اتنی تیزی سے یاد آیا کہ یلغار کا سماں بن گیا.........

ٹرین کراچی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ سب بے تاب تھے۔ لڑکے دروازوں پر کھڑے تھے۔ لڑکیاں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ میں اس وقت صرف آنکھیں بنا شبنم کو تک رہا تھا اور وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

پھر کراچی کینٹ آ گیا۔ پہلے لڑکیاں اتر گئیں۔ شبنم اور افشاں بھی اتر گئیں۔ میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ شبنم کے ابو اور امی اسے لینے آئے تھے۔ افشاں بھی ساتھ تھی۔ شبنم اپنے پاپا سے لپٹ گئی تھی۔ میں اسے دیکھتے اور بند ہونٹوں سے آوازیں دیتا رہا مگر اس نے کن انکھیوں سے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کے پاپا نے ایک قلی کو بلایا اور سامان اٹھانے کو کہا پھر وہ سب اوورہیڈ برج کی طرف چل دیئے۔

میں ہمہ تن صدا بنا انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا' جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

چار دن بعد جاوید کے گھر پارٹی تھی۔ ٹوور پر جانے والے تمام لوگوں کی گیٹ ٹوگیدر۔ میں وہاں گیا لیکن شبنم اور افشاں نہیں آئی تھیں۔ شبنم کا فون نمبر میرے پاس تھا لیکن بہتر یہی تھا کہ وہ مجھے فون کرے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اکیلا رہتا ہوں جبکہ اس کے گھر میں فون کوئی بھی ریسیو کر سکتا تھا۔ میں اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ فون کے پاس سے ہٹنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ گھر سے اس ڈر سے نہیں نکلتا تھا کہ اس کا فون نہ آ جائے۔

دسویں دن میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا لیکن مردانہ آواز سن کر ریسیور رکھ دیا۔ متعدد کوششوں کے بعد ایک بار اس کی آواز سنائی دی تو میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"شبنم......... میں ظفر بول رہا ہوں۔"

"اس وقت سب لوگ بیٹھے ہیں" اس نے سرگوشی میں کہا پھر زور سے ہیلو کہا اور بولی "میں خود آپ کو فون کروں گی۔"

"میں کب سے منتظر ہوں تمہارے فون کا" میں نے کہا لیکن وہ ریسیور رکھ چکی تھی۔

اس کے تین دن بعد ایک رات ساڑھے گیارہ بجے اس کا فون آیا۔ میں تو کھل اٹھا "کیسے ہیں آپ؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"بہت برے حال میں ہوں۔" میں نے فریاد کی "تم نے بڑا ظلم کیا کہ اتنی تاخیر سے فون کیا۔ میں تو کسی کام کا بھی نہیں رہا۔ گھر سے باہر بھی بلاضرورت نہیں نکلتا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "یہ تو برا کر رہے ہیں آپ۔ اپنے کام پر توجہ دیں۔"

"تمہاری توجہ کے بغیر یہ ممکن نہیں۔"

"موقع ہی نہیں ملا فون کرنے کا۔ بہرحال اب تو خوش ہیں!؟"

"خوش تو ہوں لیکن یہ بتاؤ اپنے پاپا سے بات بھی کی میرے متعلق؟"

"موقع دیکھ کر کروں گی۔ اتنی نازک بات ہے۔"

"لیکن تمہارے پاپا تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اتنا بڑا دھماکا ایسے تو نہیں کیا جاسکتا۔"

"مگر میرا دل ڈر رہا ہے۔"

"مجھ پر بھروسا نہیں؟"

"بھروسا تو ہے۔ سنو......... تم نے اسٹیشن پر نہ ریل میں......... مجھے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔"

"خدا حافظ کیوں کہتی۔ کوئی بچھڑ تو نہیں رہی تھی آپ سے؟"

میرا خون سیروں بڑھا ہوگا "پھر پاپا سے کب بات کرو گی؟"

"دو ایک دن میں کروں گی" اس نے کہا پھر اچانک سرگوشی میں بولی "کوئی آرہا ہے۔ میں پھر رنگ کروں گی آپ کو۔"

اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران اس نے تین بار مجھے فون کیا۔ ہر بار گفتگو کچھ ایسی ہی ہوئی۔ چوتھی بار اس نے فون کیا تو میں نے کہا۔ "تم اپنے پاپا سے بات کرلو

ورنہ میں خود تمہارے گھر آجاؤں گا"

"کیا واقعی؟" اس کی آواز میں چہکار تھی۔

"بالکل۔ میں ڈرتا کسی سے نہیں ہوں اور پھر یہ کوئی ناجائز بات تو ہے نہیں۔ کہو تو کل ہی آجاؤں؟"

"ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ بات بگڑ جائے گی۔"

"دیکھو، ہمیں واپس آئے دو مہینے ہو چکے ہیں" میں نے کہا۔ "اور میں معلق حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ میں تو عضو معطل بن کر رہ گیا ہوں۔ کل تک تم اپنے پاپا سے بات کرلو ورنہ پرسوں میں تمہارے گھر آرہا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر شبنم کی ہچکچاتی آواز سنائی دی "میرا خیال ہے، آپ کو بتا ہی دوں" میرا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرزنے لگا "میں نے پاپا سے بات کی تھی مگر یہاں اسی وقت گڑبڑ ہوچکی تھی، جب ہم سفر میں تھے۔ افشاں کے ابو ہمارے ہاں آئے تھے......... بات پکی کرنے اور ابو نے ہاں کردی تھی۔"

"تو پھر؟"

"پاپا نے کہا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"تم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش........."

"انہوں نے مجھے قائل کرلیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ خود کو شوٹ کرلیں گے۔"

میں سناٹے میں آگیا "یہ کب کی بات ہے؟"

"ہماری واپسی کو تین دن ہوئے تھے۔"

"تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"تم نے سوچا ہوگا شادی کے بعد بتاؤ گی تو میں پریشان نہیں ہوں گا" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں......... میں کیا کرتی........." وہ رونے لگی۔

میں پگھل گیا "اب کیا ہوگا؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے بھول جائیے۔ اب نہ میں آپ کو فون کروں گی' نہ آپ کیجئے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"پلیز' دیکھیں' میری عزت کا سوال ہے۔ سنیں......... کوئی آرہا ہے۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"شبنم........." لیکن رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

وہ بہت کٹھن رات تھی۔ جانے کتنی بار میں نے اس کا نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کیا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکا۔

اپنی ان دنوں کی کیفیت میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ صبح ہوتی تھی' شام ہو جاتی تھی۔ رات گزر جاتی تھی۔ اس نے فون نہیں کیا۔ میں ریسیور اٹھاتا تو اس کی آواز کان میں گونجتی......... دیکھیں' میری عزت کا سوال ہے۔ بے بسی جسم کو شل کر دیتی تو مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی۔

جانے کتنے دن بیت گئے۔ ایک رات ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی تو میں نے کہا "پلیز......... مجھے شبنم صاحبہ سے بات کرنی ہے۔"

"آپ کون ہیں؟"

"میں ان کا کلاس فیلو ہوں ظفر۔"

چند لمحے بعد شبنم کی ہیلو سنائی دی۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا شبنم!" میں چلایا۔

"اچھا......... وہ نوٹس۔ ابھی نامکمل ہیں۔"

"شبنم......... میری شبنم........."

"میں آج رات انہیں مکمل کر لوں گی"۔ اس نے "آج رات" پر زور دیا "کل کلاس میں مجھ سے لے لیجئے گا۔"

"شبنم پلیز......... آج مجھے فون ضرور کرنا ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' اچھا خدا حافظ۔"

اسی رات شبنم نے دو بجے کے بعد فون کیا "اب بتائیں' آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں بے رخی بھی تھی اور برہمی بھی۔

"تم جانتی ہو' میں کیا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی وہی چاہتی ہوں لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ میں مجبور ہوں' کیا کروں؟"

"شبنم......... مجھے اپنے پاپا سے بات کرنے دو۔ یہ ہماری زندگی کا سوال ہے۔ ممکن ہے' میں انہیں قائل کر لوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ خدانخواستہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میں انہیں قائل نہیں کر سکی تو آپ کیسے کریں گے۔"

"تو پھر؟ اب کوئی امکان نہیں رہا؟"

وہ رونے لگی "جب میں نے یہ زہر پی لیا ہے تو آپ کیوں نہیں پی سکتے۔ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے؟"

"سب کچھ کر سکتا ہوں" میں نے کہا اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "اچھا......... تم مجھ سے ایک بار مل لو۔"

"یہ مناسب نہیں۔ بجھتی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھے گی۔"

"تم میری حالت نہیں سمجھ رہی ہو" میں نے کہا "مجھ پر کبھی ایسی دیوانگی اور وحشت طاری ہوتی ہے کہ خود پر اختیار نہیں رہتا۔ ڈرتا ہوں' ایسے میں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے' جو تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔"

"مجھے دھمکی دے رہے ہیں آپ؟" اس نے تند لہجے میں کہا۔

مجھے شاک لگا "یہ کیسے سوچا تم نے؟ مجھے اتنا گھٹیا سمجھا ہے تم نے؟"

اس کا لہجہ نرم ہوگیا "میری اپنی ذہنی کیفیت بھی اچھی نہیں۔ اچھا سنیں.........
ایک شرط پر میں آپ سے مل سکتی ہوں۔ پھر آپ کبھی مجھ سے رابطہ نہیں رکھیں گے۔
مجھے بھول جائیں گے۔ بولیں......... وعدہ کرتے ہیں؟"

"اتنی کڑی شرط؟" میں نے فریاد کی مگر اس کے اصرار پر مجھے وعدہ کرنا پڑا۔ میں
اسے دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ وہ میرے گھر آنے کو تیار نہیں ہوئی۔ اگلی صبح دس بجے ایک
ریسٹورنٹ میں ملاقات طے پائی۔

وہ اور حسین لگ رہی تھی۔ میں مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ کتنی صدیاں ہوگئی
تھیں اسے دیکھے ہوئے۔ ویٹر چائے رکھ کر چلا گیا تھا۔ وہ چائے بنانے لگی۔ چائے کی پیالی
میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی "اب بتائیں........."

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں؟ تم نے تو سب کچھ ختم کر دیا۔" میں نے
آہ بھر کر کہا۔

"میں نے نہیں، تقدیر نے۔ آپ نے برا کیا کہ اس ملاقات پر مجھے مجبور کیا۔ اب
پھر سے وہی دکھ اٹھانا پڑے گا۔"

"سوری۔ لیکن میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہم چائے کے گھونٹ لیتے رہے پھر اچانک اس نے کہا
"غلطی آپ کی ہے۔ آپ نے مجھے مضبوطی نہیں دی ورنہ شاید میں پاپا کے سامنے ڈٹ
جاتی۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم نے تنہائی کے......... قربت کے اتنے لمحے گزارے۔ آپ نے کبھی مجھے یہ
اعتماد نہیں دیا کہ میں آپ کو بہت اچھی لگتی ہوں۔"

میں حیران رہ گیا "یہ......... یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"اور اسلام آباد میں تو آپ نے حد ہی کر دی" وہ نظریں جھکائے کہتی رہی "آپ
اس رات مجھے own کر سکتے تھے۔ اس صورت میں، میں اپنے وجود کو آپ کی امانت

سمجھ لیتی اور پھر جان دے کر بھی خود کو کہیں اور جانے سے بچاتی مگر مجھے تو اس وقت سے
ایسا لگتا رہا ہے کہ مجھ میں آپ کے لیے کشش نہیں۔ میں اس رات اپنی نظروں سے گر
گئی۔ نہ مجھے خود پر اعتماد رہا نہ آپ کی محبت پر۔ میں پاپا کے سامنے سر اٹھا کر کیسے کھڑی
ہوتی۔"

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ نکتۂ نظر کا اتنا بڑا فرق "حالانکہ اس کے بعد تمہیں میری
محبت پر زندہ اعتماد ہو جانا چاہیے تھا" بالآخر میں نے کہا "تم جانتی ہو کہ تم مجھے کتنی اچھی
لگتی ہو۔ میں نے تو تمہیں شیشے سے نازک سمجھ کر ان تند لمحوں میں خود سے جنگ کی
تھی" میں کہتے کہتے رکا "خیر اب میں تمہیں اعتماد دے رہا ہوں۔ اب ڈٹ جاؤ۔"

"اب یہ ممکن نہیں۔ میں ہار چکی ہوں۔ اسی رات ہار گئی تھی۔"

"میں تمہارے نکتۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ مجھے اس پر افسوس ہے" میں
نے کہا "جس پر تمہیں شکایت ہے، وہ تو بہت آسان تھا اور میں نے جو کچھ کیا، وہ کتنا
مشکل تھا یہ میرا دل جانتا ہے۔ پلیز شبنم......... اب بھی کچھ نہیں بگڑا........."

"نہیں ظفر۔ اپنا وعدہ یاد کیجیے۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔"

"شبنم......... تم غلط کر رہی ہو۔ تمہارا اب وہاں شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ افشاں
کسی بھی وقت اپنے بھائی کو یہ سب کچھ بتا سکتی ہے اور اس صورت میں کون یقین کرے
گا کہ ہم........."

"یہی تو مجھے شکایت ہے آپ سے" اس نے میری بات کاٹ دی "کوئی یقین نہیں
کرے گا یعنی خواہ مخواہ کی تہمت اٹھاؤں گی میں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ کچھ خوب صورت
یادیں ہی مل جاتیں مجھے۔" وہ کہتے کہتے رکی "لیکن افشاں کی آپ فکر نہ کریں۔ سلمان
کے ساتھ جو اس کا چکر تھا، میں اس سے واقف ہوں اچھی طرح اور افشاں کو بھی میری
بھابی بننا ہے۔"

وہ میرے لیے بڑا دھماکا تھا۔ میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس
نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی "اب میں چلتی ہوں۔ اپنے وعدے

پر قائم رہے گا۔ اگر آپ نے کسی بھی طور اب مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش کی تو خدا کی قسم میں خود کو ختم کرلوں گی۔ خدا حافظ۔"

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور وہ چلی گئی۔

وقت اور زندگی کئی دن تک ایک مرکز پر ٹھہرے رہے پھر دونوں بہنے لگے۔ سب کچھ معمول پر آگیا لیکن ایک زخم تھا سینے میں' جس سے رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ مگر میں نے کراچی کے واقعات کو کبھی یاد نہیں کیا۔ ان سے کتراتا........ نظریں چراتا رہا۔

اور اب........ دو سال بعد فیصل ہوٹل ایبٹ آباد کے کمرے میں' تنہائی میں بیٹھ کر میں نے ان تلخ یادوں کو دہرایا تھا تو گرہیں کھلنے لگی تھیں۔ سوالوں کے جواب ذہن میں پنجے چبھو رہے تھے۔ مجھے بس ان کو گرفت میں لینا تھا۔ بہت ساری باتیں تھیں' جو اب دھنک آنکھوں سے تحلیل ہونے کے بعد سمجھ میں آرہی تھیں۔ بہت کچھ واضح ہونے لگا تھا۔

یہ طے تھا کہ شبنم سفر کے عرصے میں مجھ سے جسمانی ربط ضبط کی خواہاں تھی۔ اس کی کیفیات مجھے یاد تھیں۔ ممکن ہے' اسے مجھ میں صرف جسمانی کشش محسوس ہوئی ہو۔ جب اس نے دیکھا کہ منگنی کا علم ہونے کے بعد میں کھنچ گیا ہوں تو اس نے نعیم کے ذریعے مجھ تک یہ بات پہنچائی کہ وہ اپنی منگنی سے خوش نہیں ہے اور یہ کہ مجھے پسند بھی کرنے لگی ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اپنے اس دعوے میں سچی تھی۔ امکان بہرحال یہی تھا کہ اس کا مجھ سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح محض اچھا وقت گزارنا چاہتی تھی۔ شاید میں اس کے لیے سووینئر تھا اس سفر کا۔ شاید اسی لیے کراچی پہنچتے ہی وہ بدل گئی تھی بلکہ کراچی کے سفر کے دوران ہی وہ مجھ سے کھنچ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے' اس میں اس حماقت کا بھی دخل ہو' جو میں نے اس کے پندار حسن کو ٹھیس پہنچا کر کی تھی۔

اور وہ آخری دھماکا! شبنم اور افشاں کزن تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی بھابی بننے والی تھیں۔ دونوں کو سفر کے دوران ایک دوسرے کے افیئر کا علم تھا۔ دونوں کے درمیان

ایک خاموش سمجھوتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے چشم پوشی کر رہی تھیں۔

اس دھماکے نے میری گویائی سلب کرلی تھی۔ ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں شبنم سے ایک آخری سوال ضرور کرتا مگر نہیں کرسکا تھا اور وہ چلی گئی تھی۔

میرے تصور میں اسلام آباد کی اس رات کا منظر پھر گیا۔ میں اندھیرے پورٹیکو میں ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ شبنم اور افشاں سلمان اور رشید کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ شبنم نے آخری ملاقات میں بتا دیا تھا کہ وہ سلمان اور افشاں کے چکر سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا........ اشارہ بھی نہیں دیا تھا کہ افشاں کا چکر سلمان اور رشید دونوں سے چل رہا تھا۔ تو پھر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ٹہلنے والے چار نہیں بلکہ تین ہوتے۔ رشید نہ ہوتا بلکہ فطری بات تو یہ تھی کہ صرف افشاں اور سلمان ٹہلتے نظر آتے۔ سوال یہ تھا کہ اس کے ساتھ رشید کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی؟ تو کیا رشید........ اور شبنم!

اس سے آگے سوچنا ممکن نہیں تھا لیکن میں اب بے رحمی سے حقائق کو کھوجنے کے موڈ میں تھا۔ مجھے ان کی ترتیب یاد تھی۔ دونوں لڑکیاں درمیان میں تھیں اور دونوں لڑکے دائیں بائیں تھے۔ میں اندھیرے میں دیکھ نہیں سکا تھا لیکن فطری بات یہی تھی کہ رشید شبنم کے ساتھ ہوگا اور اگر ایسا تھا تو شبنم........؟ اس سے آگے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں کافی حد تک ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ بس ایک سوال تھا........ اپنے بارے میں۔ دو سال تک میرا رویہ شترمرغ کا سا کیوں تھا۔ مجھے دکھ کس بات کا تھا آخر؟ وہ زخم انا تھا یا زخم محبت۔ خود کو ٹٹولنا' اپنے بارے میں حقیقت جاننا بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن اب معاملہ پوری طرح کھل چکا تھا۔ آخری ملاقات میں اسلام آباد والی رات کے حوالے سے شبنم نے مجھے گالی دی تھی۔ اس نے اپنی مجروح انا' اپنی توہین پندار حسن کا انتقام مجھے زخم انا دے کرلیا تھا۔ ہاں........ وہ زخم انا تھا۔ اور یہ بات میں جانتا تھا۔ نہ جانتا ہوتا تو یہ شعر کیسے کہا ہوتا میں نے۔

اک زخم محبت کہ نہاں ہے نہ عیاں ہے
اک زخم انا ہے کہ نہاں بھی ہے عیاں بھی

میں بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا ہوگیا۔ لگتا تھا' روح پر برسوں سے رکھا بھاری چٹان سا بوجھ اتر گیا ہے۔ ساتھ ہی زبردست بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بجے تھے۔ باہر جانے کو جی نہیں چاہا۔ میں نے ویٹر کو طلب کر کے کھانا منگوایا اور کھانا کھاتے ہی سو گیا۔

دو سال سے میں اتنی پرسکون نیند نہیں لے سکا تھا!

☆============☆============☆

سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ میں خود جو بدل گیا تھا۔ اب میں تازہ دم تھا......... خوش و خرم۔ اب میں ہر چیز کو انجوائے کر سکتا تھا......... دھوپ کو' ہوا کو' بارش کو' حسنِ فطرت کو' سفر کو' سفر میں ہونے والی تکالیف کو۔ میں خوش تھا' اندر کا موسم بدل گیا تھا۔

اگلی صبح پھر سفر شروع ہوا تھا "یہ مانسہرہ ہے......... گیٹ وے آف ناردرن ایریاز" میں طاہر کو بتا رہا تھا "مانسہرہ......... دنیا کے حسین ترین ضلعوں میں سے ایک۔ یہ شاہراہ ریشم ہے۔ گلگت اور چین۔ ہم اس طرف جائیں گے۔ اب تم راستوں کو مِس نہیں کرنا چاہو گے۔"

لمبا سفر ہونے کی وجہ سے ہم بہت سویرے نکلے تھے۔ سورج اب مشرقی افق سے جھانک رہا تھا۔ نرم دھوپ میں سرسبز پہاڑوں اور پہاڑی ڈھلوانوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ڈرائیور نے کیسٹ لگا دیا۔ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔

"سبحان اللہ" طاہر نے بے ساختہ کہا۔ مانسہرہ میں چاول بہت کاشت کیا جاتا ہے۔ مسطح ڈھلوانوں پر اوپر نیچے' قدم قدم پر چاول کے کھیت ہوتے ہیں' جو نیچے اترتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کھیتوں میں موجود پانی دھان کی بالیوں سے جھانکتا ہے تو کھیت آئینہ خانے لگتے ہیں۔ بلاشبہ وہ بہت خوب صورت اور روح پرور منظر ہوتا ہے۔

"سفر تو اب شروع ہوا ہے" میں گنگنایا۔

طاہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ منظر کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔ کھڑکی کی طرف کبھی پہاڑ آتا تھا تو کبھی کھائی۔ کیونکہ یہ چکردار سفر تھا اور پہاڑ ہو یا کھائی' ہر طرف قدرتی

ترتیب سے چیڑ کے بلند و بالا درخت استادہ تھے۔ انہوں نے پہاڑوں اور ڈھلانوں کو پرشکوہ بنا دیا تھا۔

ہم اسکاؤٹس نیشنل ٹریننگ سینٹر جنگل منگل سے گزر گئے۔ اب بٹراسی کا علاقہ شروع ہو رہا تھا "اب بٹراسی کے موڑ آئیں گے" میں نے طاہر کو بتایا "شاید پاکستان میں اتنے کم فاصلے پر کہیں اتنی بڑی تعداد میں موڑ نہیں ہیں۔ یوں کہو کہ موڑ پر موڑ چڑھا ہوا ہے۔ ایک سے ایک خطرناک موڑ ہے۔ گاڑی ایک موڑ سے سنبھل رہی ہوتی ہے تو دوسرا موڑ درپیش ہوتا ہے پھر تیسرا' چوتھا......... پانچواں......... یہ سلسلہ لامتناہی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار موڑ شمار کرنے کی کوشش کی......... مگر دو سوا دو سو گننے کے بعد گنتی بھول گیا........."

"اتنے موڑ؟" طاہر نے بے یقینی سے کہا۔

"تمہارے لیے بھی موقع ہے۔ اب گنتی شروع کر دینا۔"

نعیم نے کیمرہ سنبھال لیا اور دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ اس نے سائرہ کو ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔

ہم بس میں داہنی جانب والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ طاہر نے فوراً ہی گنتی سے توبہ کر لی "یہ قابل دید مناظر چھوڑ کر موڑ گننا تو بے وقوفی ہے" اس نے کہا۔

اچانک ہمیں دریائے کنہار کی پہلی جھلک نظر آئی......... نیچے......... بہت نیچے چاندی کا بل کھاتا تار سبزے پر بچھا نظر آ رہا تھا۔ طاہر مسحور ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

اب ڈھلوانی سفر شروع ہو رہا تھا۔ پہاڑ سے اترتے ہوئے میرا دل کسی حد تک بگڑنے لگتا ہے۔ میں نے سائرہ سے کہا "وہ فانٹا والی میٹھی گولیاں نکالو" گولی منہ میں ڈال کر میں پھر باہر دیکھنے لگا۔ طاہر باہر کے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ اسے ادھر ادھر کی خبر ہی نہیں تھی۔

پیچھے کی سیٹ پر ایک لڑکے کو الٹیاں ہونے لگیں۔ اسے دوا دی گئی اور اس کے ساتھیوں نے اسے سیٹ پر لٹا لیا۔

ہم گڑھی حبیب اللہ پہنچنے والے تھے!

گڑھی حبیب اللہ سے بالاکوٹ تک تقریباً زمینی سفر ہے۔ سڑک البتہ اچھی نہیں ہے۔ (بعد میں ۹۲ء کے بدترین سیلاب اور لینڈ سلائیڈنگ نے تو بہت کچھ ختم کر دیا۔ سڑک کو بھی اکھاڑ پھینکا اور اب متبادل کچی سڑک سے کام چل رہا ہے۔)

اب وہ مقام آنے والا تھا' جہاں داہنی سمت والے ایک پہاڑ سے ہلکے چاکلیٹی رنگ کا پانی پہاڑی نالے کی شکل میں آتا اور دریائے کنہار کا پانی اور چاکلیٹی پانی یوں گلے مل کر چلتے ہیں کہ الگ الگ نظر آتے ہیں۔ شفاف پانی کے نیچے رنگین پانی نظر آتا ہے' کافی آگے جا کر دونوں پانی ملتے ہیں۔ میں نے طاہر سے پانی پر نظر رکھنے کو کہا۔ پھر اچانک طاہر نے کہا۔ "ارے واقعی......... کیا خوب صورت منظر ہے۔ میں اس کی تصویر ضرور بناؤں گا۔"

"کم از کم دو تصویریں بنانا" میں نے مشورہ دیا "آگے وہ مقام آئے گا جہاں یہ چاکلیٹی نالہ دریا میں گرتا ہے۔"

طاہر نے ایک تصویر بنالی۔ کیمرہ اس نے گود میں رکھ لیا تھا اور اب منتظر تھا وہ مقام نظر آئے۔

بالاکوٹ میں فی الحال ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رکنا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھنا تھی اور کھانا کھا کر ناران کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ بالاکوٹ صوبہ سرحد میں ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی حیثیت لازوال ہے۔ صوبہ سرحد میں احیائے اسلام کا جہاد سید احمد اور ان کے رفقاء کی شہادت کے ساتھ انمٹ نقوش چھوڑ گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں سادات پورے صوبے میں آباد ہوئے اور محترم قرار پائے۔

بالاکوٹ میں' میں ہمیشہ متاسف ہو جاتا ہوں۔ پاکستان بنے چالیس سال ہو چکے لیکن کسی حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ سید صاحب کے اس جہاد عظیم کو ہماری تاریخ میں جو مقام ملنا چاہیے تھا' وہ نہیں دیا گیا۔ ہمارے بچوں کو علم نہیں کہ ان دشوار گزار

پہاڑوں میں، سخت ترین موسموں میں کس طرح اسلام کی تبلیغ کی گئی......... کس طرح سکھوں کے جبرواستبداد سے نبرد آزما ہوا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں مینار شہدا تعمیر کیا جاتا لیکن کیا تو اور بھی بہت کچھ نہیں گیا۔

بالاکوٹ میں چپلی کباب بہت اچھے ہوتے ہیں۔ سر ممنون نے دوپہر کھانے کے لیے نان اور چپلی کباب کا ہی بندوبست کیا تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ میں ہم دو گھنٹے رکے۔ کھانا اسکول کے باغیچے میں کھایا۔ واپسی میں یہاں ایک رات رکنے کا ارادہ تھا۔

اب چڑھائی کا سفر تھا۔ ہم وادی کاغان میں داخل ہو چکے تھے۔ کیوائی سے ہم لوگوں نے تھرموس میں چائے بھروائی۔ یہاں چائے بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اب ہر طرف نظرنواز مناظر تھے۔ پایہ بہ پایہ دھان کے کھیتوں کے آئینہ خانے نظر آرہے تھے۔ چپا چپا سرسبز تھا۔ پتھر تک سبزے سے آراستہ تھے۔

پیاس لگی تو ایک پہاڑی نالے کے قریب گاڑی رکوائی گئی۔ لوگوں نے اچھی طرح پانی پیا۔ فریج کا سا ٹھنڈا پانی تھا۔ بعض لوگوں نے اتنا ٹھنڈا پانی دیکھ کر کولر بھی بھر لیے۔

ہم اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ بعض مقامات پر تو بس کا انجن بھی ہانپنے لگتا تھا۔

اچانک طاہر نے پوچھا "یہ شور کیسا ہے؟"

"اب وقت آگیا ہے کہ تم کنہار سے تعارف حاصل کرلو" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ کنہار دہاڑ رہا ہے دوست" میں نے کہا پھر میں بائیں جانب والی کھڑکی کے ساتھ بیٹھی مس راشدہ سے مخاطب ہوا "اگر مائنڈ نہ کریں تو آپ اس طرف ہماری سیٹ پر آجائیں۔ یہ طاہر پہلی بار آئے ہیں اور کنہار سے ملنا چاہتے ہیں۔"

مس راشدہ مسکرائیں "کیوں نہیں۔ آپ لوگ اس طرف آجایئے۔"

ہم لوگوں نے سیٹیں تبدیل کرلیں۔ اب طاہر بائیں جانب والی کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں اس کے برابر بیٹھا تھا۔ یہ دو والی سیٹ تھی "جاتے ہوئے پورے سفر میں کنہار اس طرف رہے گا" میں نے اسے بتایا۔

طاہر نے باہر نیچے کی طرف دیکھا۔ سیکڑوں فٹ نیچے دریا اپنے مخصوص جوش وخروش کے ساتھ بہہ رہا تھا......... دہاڑتا، چنگھاڑتا، کف اڑاتا۔ بعض مقامات پر اس کا شور اتنا بلند ہوتا کہ ہمارے لیے بس میں ایک دوسرے کی بات سننا بھی آسان نہیں رہتا تھا۔

"یہ......... یہ کنہار ہے؟" طاہر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں۔ لیکن تم گڑھی حبیب اللہ اور بالاکوٹ سے اس کا تصور لے کر چلے ہو اس لیے شاک تو تمہیں لگنا تھا۔ میں نے گڑھی حبیب اللہ پر کہا تھا نا کہ یہ اس تھکے ماندے مسافر کی طرح ہے، جو طویل اور کٹھن مسافت طے کرکے منزل پر پہنچا ہو۔ اب یہ بھی دیکھ لو کہ اس کا سفر کیسا تھکا دینے والا ہے۔"

"واقعی......... یہ تو بہت غصہ ور دریا ہے" طاہر نے کہا "لیکن ظفر بھائی، اس کا پاٹ تو کچھ بھی نہیں۔ بس ندی لگتا ہے۔"

"پہاڑی دریا اپنے پاٹ سے نہیں، زور اور بہاؤ سے پہچانے جاتے ہیں اور ایسا زور آور دریا شاید ہی کوئی ہو۔"

"نیچے کتنا پُرشور ہوگا یہ؟"

"اس کے بہنے کا شور ماحول کا حصہ ہے۔ اس کا تجربہ تمہیں ناران پہنچ کر ہو جائے گا اور یہ صرف پُرشور نہیں، مغلوب الغضب دریا ہے۔ تین یا چار سال پہلے ہم ناران سے واپس جارہے تھے۔ ہمارے گزرنے سے ذرا پہلے ناران اور کاغان کے درمیان ایک جیپ دریا میں گر گئی تھی۔ جگہ جگہ جال ڈالے گئے دریا میں لیکن دریا جال توڑ کر جیپ کو گھسیٹتا چلا گیا۔ کوئی ۳۵ کلومیٹر آگے جیپ نکالی جاسکی۔"

طاہر کے جسم میں واضح لرزش نظر آئی "اور جیپ کے مسافر؟"

"ان کی مشکل تو ابتدا ہی میں یخ بستہ پانی نے آسان کر دی ہوگی۔ اس پانی میں تو مشاق پیراک بھی پانچ منٹ نہیں جی سکتا۔"

"اس کا بہاؤ اتنا تیز کیوں ہے؟"

"ایک تو یہ اوپر سے نیچے آرہا ہے۔ اس لیے بہاؤ تو تیز ہونا ہی ہے۔ دوسرے اس کی رہگذر میں ہر قدم پر بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔ یہ ان کو پھلانگتا ہوا بڑھتا ہے۔ یہی اس کے شور کا سبب بھی ہے۔"

طاہر مبہوت ہو کر دریا کو دیکھتا رہا۔ ایک موقعے پر وہ جھرجھری لے کر رہ گیا "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ظفر بھائی......... بس کا اس طرف والا وھیل تین چوتھائی سے زیادہ سڑک سے باہر تھا" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"ایسا تو ہوتا ہے۔"

"ظفر بھائی......... آپ سمجھ نہیں رہے۔ تقریباً پورا پہیہ معلق تھا۔"

"ہاں بھائی......... ایسا ہوتا ہے۔ جھیل سیف الملوک جاتے ہوئے تو ممکن ہے اس سے بھی زیادہ دیکھو۔" میں نے کہا "یہ تو پکی سڑک ہے۔ کاغان کے بعد تو زیادہ راستے کچی سڑک ہی ملے گی۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم کاغان پہنچ گئے۔ وہاں کچھ دیر رکے۔ سڑک کے ساتھ ہی کاغان ہوٹل ہے۔ ہم اس کے ریسٹورنٹ میں جابیٹھے۔ سرممنون خواتین کو بطور خاص وہاں لے آئے۔ چائے منگوالی گئی۔

کاغان ہوٹل جدید طرز کا ہوٹل ہے۔ بہت صاف ستھرے باتھ روم ہیں۔ خواتین کے لیے تو وہ نعمت عظمیٰ ثابت ہوئے۔ باتھ روم کے لیے لائن لگ گئی۔

اس کے بعد سفر آخری مرحلے میں داخل ہوگیا۔

ناران کاغان سے صرف ۲۳ کلومیٹر دور ہے لیکن اس فاصلے کو طے کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ سڑک کچی ہے اور سلائیڈنگ کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ دوسری وجہ وہ بڑا گلیشیر ہے جس سے گزرے بغیر ناران میں داخل نہیں ہوسکتے۔

کاغان سے روانگی کے ایک گھنٹے بعد ہم گلیشیر پہنچے۔ ڈرائیور نے بس روک دی۔

سرممنون نے ہدایت کی کہ سب لوگ اتر جائیں۔ سفیر شاہ بھی اتر آیا اور کسی ایسے جرنیل کی طرح گلیشیر کا معائنہ کرنے لگا، جو جنگی حکمت عملی ترتیب دے رہا ہو۔

خاصے لوگ ایسے تھے، جو پہلی بار گلیشیر دیکھ رہے تھے۔ کیمرے نکل آئے تھے۔ جن کے پاس چھڑیاں تھیں، انہوں نے چھڑیاں لے لی تھیں۔ تھکے ہوئے چہروں پر بشاشت دوڑ گئی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں آگئی تھیں۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ برف دیکھنا انسان کے لئے کتنی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اور اس سے مستثنیٰ کوئی بھی نہیں۔ ہر انسان برف دیکھ کر اندر سے بچہ بن جاتا ہے۔ سو بیشتر لوگ وہاں پکنک منانے لگے۔

سفیر شاہ راستے کو چیک کر رہا تھا۔ گلیشیر میں ایک مقام پر چھوٹا سا ایک غار سا تھا۔ وہ اسے پُرتشویش نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر قریب کھڑے سرممنون سے بولا "یہ خطرناک ہے سر!"

"پھر کیا کرو گے؟"

"پار کریں گے انشاء اللہ۔ لیکن سر، رسے باندھنے پڑیں گے احتیاطاً کچھ تگڑے جوان پکڑیں۔"

سرممنون نے لڑکوں کو آواز دی۔ سفیر شاہ اور حمید بس کو رسوں سے باندھنے میں مصروف ہوگئے۔ سرممنون نے لڑکوں کو سمجھایا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ چند لڑکوں کے چہرے فق ہوگئے لیکن بیشتر کو ایڈونچر کے خیال نے پُرجوش بنا دیا۔

ان لڑکوں کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی کیونکہ غار کے سامنے سے گزرتے ہوئے بس بے قابو ہونے لگی۔ چند لمحے تو ایسا لگا کہ بس اس غار میں گھس جائے گی لیکن لڑکوں نے پورا زور لگادیا۔ بس نے گلیشیر عبور کرلیا۔

ہم ناران پہنچ چکے تھے!

☆============☆============☆

ہمارا قیام گورنمنٹ ہائی اسکول ناران میں تھا۔ اسکول کی گرمی کی پندرہ دن کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ سردی میں تین ماہ......... دسمبر، جنوری اور فروری تعطیلات رہتی

ہیں۔ ہم جس وقت ناران پہنچے' گرمی کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں لہٰذا اسکول لگ رہا تھا لیکن اسکول کے ہیڈ ماسٹر حاجی مشتاق اعوان صاحب نے کمال مہربانی سے ہمارے لیے دو کمرے خالی کروا دیئے لیکن اس وعدے پر کہ ہم لوگ جب تک رکیں گے' صبح سات بجے سے پہلے اپنا سامان سمیٹ کر باہر برآمدے میں رکھ دیں گے تاکہ بچے آئیں تو ڈسٹرب نہ ہوں۔ چھٹی کے بعد وہ کمرے پھر ہمارے ہوں گے۔

مشتاق اعوان صاحب عطر شیشہ گاؤں' مانسہرہ کے رہنے والے ہیں۔ بہت خوب صورت آدمی ہیں اور دل اور بھی خوب صورت رکھتے ہیں۔ تعلیم اسے انہیں عشق ہے۔ تعلیم دینا ان کا پیشہ نہیں' مقصد حیات ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ صوبہ سرحد اور بالخصوص ہزارہ کو میں نے ٹیچرز کے معاملے میں بہت زرخیز دیکھا ہے۔ ملک بھر میں اتنے اچھے اور مخلص ٹیچرز نہیں ہوں گے جتنے صرف ہزارہ میں ہیں۔ شاید اتنے اچھے تعلیمی ادارے بھی کہیں اور نہ ہوں۔

ہم سہ پہر کے بعد ناران پہنچے تھے۔ سب کچھ سیٹ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ کمروں کی صفائی کی گئی۔ سامنے والی مسجد سے پانی بھروایا گیا۔ حسین بخش کو کھلے میں ایک جگہ فراہم کر دی گئی' جہاں وہ کھانا پکانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ طاہر کو دریا کے کنارے جانے کی بے تابی ہو رہی تھی۔ میں' نعیم اور طاہر دریا کی طرف چلے۔ ہماری پارٹی کے بیشتر لوگ پہلے ہی دریا کے کنارے موجود تھے۔ دریا اسکول سے نیچے کی طرف کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہے۔ دریا پر یہاں درختوں کے تنوں کا ایک پل بھی ہے' جسے رسیوں سے باندھا گیا ہے۔

طاہر نے گہری سانسیں لیں اور کئی بار سبحان اللہ کہا۔ سچ یہ ہے کہ اتنی لطیف اور تروتازہ ہوا میں سانس لیا جائے تو سانسیں بھی سبحان اللہ کا ورد کرنے لگتی ہیں۔ ہم دریا کے کنارے جا بیٹھے۔ نعیم نے اپنے پاکٹ ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا دیا۔

"اب پانی میں ہاتھ ڈال کر دکھاؤ" میں نے طاہر سے کہا۔

"کتنی دیر؟"

"ایک منٹ۔"

طاہر نے پانی میں ہاتھ ڈالا اور فوراً ہاتھ کھینچ لیا "واقعی......... بہت ٹھنڈا پانی ہے۔"

"یہ فاؤل ہے" میں نے کہا "اگر آٹھ دس بار تم نے ہاتھ ڈال کر اسی طرح کھینچ لیا تو اس کے بعد پانی میں ایک منٹ رکھنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ٹرائی کرتا ہوں۔ آپ گھڑی دیکھ کر ریڈی کہیں۔"

میں اپنی گھڑی کو دیکھتا رہا پھر میں نے کہا "ریڈی" اور طاہر نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا......... کلائی تک۔ میری نظریں گھڑی پر تھیں۔ سیکنڈ کی سوئی اپنی مخصوص رفتار سے تھرک رہی تھی۔ اچانک طاہر نے ہاتھ پانی سے کھینچ لیا اور سیدھے ہاتھ سے اس ہاتھ کو پوری قوت سے مسلنے لگا "سن ہو گیا ہے بالکل۔"

"اور صرف چالیس سیکنڈ میں۔"

طاہر دیر تک ہاتھ گرم کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے پوچھا "یہ پانی پی سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ یہ پاک پانی ہے۔"

وہ جھک کر پانی پینے لگا۔ منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ "مزہ آ گیا۔"

ہماری داہنی جانب عجیب منظر تھا۔ دو مقامی بچے وہاں شاید کھیل رہے ہوں گے ہماری پارٹی کی کچھ لڑکیاں وہاں پہنچ گئیں۔ بچے بے حد خوب صورت تھے......... سرخ و سفید۔ لڑکیوں نے ان کی بہت تعریف کی اور پیار کیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ صائمہ اور انیلہ دریا کو ریت صابن کی طرح چہرے پر لگا رہی تھیں۔

ہم اس طرف چلے گئے۔ طاہر نے پوچھا "یہ کوئی ٹوٹکا ہو رہا ہے کیا؟"

شہناز مسکرائی "بچے بہت پیارے ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ ان کے حسن کا راز کیا ہے.........؟"

"یہ سمجھے ہی نہیں ہوں گے" میں نے کہا۔

"تو ہم نے لفظ بہ لفظ یہ تھوڑا ہی پوچھا تھا" شہناز مسکرانے لگی "ہم نے پوچھا...... اے تم منہ کس صابن سے دھوتے ہو۔ یہ نہیں سمجھے۔ پھر جب سمجھے تو کہنے لگے...... دریا کی ریت سے۔ ہم سمجھے' مذاق کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا...... دھو کر دکھاؤ۔ انہوں نے منہ دھو کر دکھا دیا۔ بس پھر ان دونوں کو گورا بننے کا شوق ستانے لگا۔"

دونوں لڑکیاں جھک کر دریا کے پانی سے منہ دھونے لگیں۔ میں نے کہا "آئلی جلد کے لیے تو یہ واقعی مفید ہے۔ البتہ خشک جلد والوں کو نقصان ہو گا۔"

صائمہ نے منہ دھو کر شہناز کو دکھایا "دیکھو...... کچھ فرق بھی پڑا؟"

"فرق تو واقعی پڑا ہے" شہناز نے حیرت سے کہا۔

ہم لوگ انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ پل کے قریب پہنچ کر طاہر نے کہا "دریا پار جانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"وہاں دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے" نعیم بولا۔

"مقصد صرف پل پر چڑھ کر دریا پار کرنا ہے۔"

"اور یہ کام خطرناک ہے۔"

"اتنے لوگ اتنے مزے سے آجا رہے ہیں" طاہر نے کہا۔

"بھائی یہ عادی ہیں۔ آنکھ بند کر کے بھی گزر سکتے ہیں۔"

"پھر بھی......"

"چلو...... چلتے ہیں" میں نے کہا "لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ پل پر سے گزرتے وقت نظر سامنے رکھنا۔ دائیں بائیں دریا کو نہ دیکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

نعیم آگے ہو گیا' طاہر درمیان میں اور میں پیچھے۔ دریا کا پاٹ پچاس ساٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ طاہر نے ابتدا میں تو میری ہدایت پر عمل کیا لیکن پھر شاید اس کی نظر بہک گئی۔ اس میں اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ دونوں جانب اچھلتا' شور مچاتا دریا جیسے آدمی کو پکارتا ہے...... اپنی طرف دیکھنے پر اکساتا ہے۔ بہرحال جو بھی ہوا' طاہر نے اچانک

گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ارے...... یہ پل اتنی زور زور سے ڈول رہا ہے...... یہ کیا......"

میں نے اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ بھی دیکھ لی تھی۔

"طاہر...... کھڑے نہ رہو' بیٹھ جاؤ" میں نے چیخ کر کہا۔ ساتھ ہی میں اس کی طرف لپکا۔ اس وقت تک وہ اکڑوں بیٹھ چکا تھا۔ "سامنے کی طرف دیکھتے رہو۔ دائیں بائیں نہ دیکھنا" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"مگر یہ پل اتنی بری طرح کیوں ہل رہا ہے؟"

"پل نہیں ہل رہا ہے۔ دریا کا تلاطم اتنا خوف ناک ہے کہ اس کی طرف دیکھو گے تو لگے گا' پل پر نہیں ہو' ہنڈولے میں بیٹھے اوپر جا رہے ہو' نیچے آ رہے ہو۔"

"بالکل یہی محسوس ہوا تھا مجھے۔"

"اس کیفیت میں آدمی خود بخود لڑکھڑا کر دریا میں گر سکتا ہے۔ پل کی چوڑائی تو بہت کم ہے نا اور دریا میں گرنے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

طاہر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"اب بہتر یہی ہے کہ بیٹھے بیٹھے پل پار کرو" میں نے کہا "کھڑا ہونا ٹھیک نہیں ہے اس وقت۔"

ہم دوسری طرف پہنچ کر ایک بڑے گول پتھر پر بیٹھ گئے۔ ناران میں ان بڑے گول پتھروں بلکہ چٹانوں کی کوئی کمی نہیں۔ اسکول کے برآمدے میں بھی بے حساب پتھر موجود تھے۔ (اب وہ پتھر توڑ کر' برآمدہ ہموار کیا جا چکا ہے۔) وہاں تعمیرات میں یہی پتھر استعمال کیے جاتے ہیں۔

طاہر اب پُرسکون ہو گیا تھا "پہلی بار مجھ پر بھی یہی گزری تھی" میں نے اسے بتایا "بیٹھ نہ گیا ہوتا تو گیا تھا پانی میں۔"

مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے پل پار کیا اور اسکول کی طرف چل دیے۔

☆============☆============☆

اگلی صبح......... ناران کی صبح۔ سرمنون نے مجھے پانچ بجے اٹھا دیا۔ وہ مجھے باہر لے آئے، جہاں خاصی سردی تھی۔ رات بھی ہم میں سے کوئی کمبل کے بغیر نہیں سویا تھا بلکہ بعض تو کمبل کے اندر بھی گھٹنے پیٹ سے لگائے سو رہے تھے۔ مجھے تھرتھری چڑھنے لگی۔

"اوپر تو دیکھو ذرا" سرمنون نے کہا۔

میں نے آسمان کو دیکھا۔ دل نے بے ساختہ سبحان اللہ کہا۔ آسمان پر رنگ ہی رنگ تھے......... تیرتے ہوئے رنگوں کے ٹکڑے......... اور اتنے نیچے کہ لگے ہاتھ بڑھاؤ اور چھولو۔ وہ بادل تھے اور تقریباً ہر رنگ کے بادل۔ بعض رنگ ایسے تھے کہ میں نے آسمان پر کبھی نہیں دیکھے تھے۔

میں لپک کر گیا اور نعیم اور طاہر کو جگایا پھر اپنا کیمرا سنبھالا۔

ہم باہر آئے تو صائمہ سرمنون کے پاس کھڑی تھی۔ وہ بھی سحرزدہ سی کھڑی ان بہت نیچے اڑتے رنگ برنگے بادلوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ طاہر بھی مبہوت ہو کر رہ گیا پھر وہ اپنا کیمرا لینے کے لیے دوڑا۔

زندگی میں اتنی حسین صبح میں نے آج تک نہیں دیکھی پھر بادل چھٹے تو سورج نے سر اٹھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ جیسے کسی خواب سے آنکھ کھل گئی ہو۔ ساتھ ہی ہم سب کو بھوک کا احساس ہوا۔ اس کا اظہار سب سے پہلے طاہر نے کیا۔

"حسین بخش اٹھ گیا ہے" سرمنون نے بتایا "تھوڑی دیر میں ناشتا مل جائے گا۔"

"نہیں سر۔ اتنی دیر انتظار کیا کرنا۔ آئیں......... آج باہر ہی ناشتا کرتے ہیں" میں نے کہا۔

سرمنون نے حسین بخش کو کچھ ہدایات دیں اور سب لوگوں کو اٹھانے کو کہا۔ اتنی دیر میں ہم لوگوں نے دانت صاف کرلیے پھر ہم ناشتے کے لیے نکل گئے۔ اسکول کے سامنے مین روڈ پر آگے جاکر پورا بازار ہے۔ کچھ دکانیں ابھی نہیں کھلی تھیں لیکن ریسٹورنٹ تمام کھلے تھے۔

ہم واپس آئے تو سب لوگ اٹھ چکے تھے۔ ناشتے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

سرمنون نے تمام سامان باہر نکلوایا اور کمروں کی صفائی کرادی۔ ذرا دیر بعد اسکول کے بچے آنے لگے۔ ہر بچے کے گلے میں بستہ تھا اور ایک ہاتھ میں سرسبز پتوں سے لدی پھندی شاخ، تختی بھی تقریباً سب کے پاس تھی۔

"یہ شاخ کس لیے؟" طاہر نے پوچھا۔

"دیکھتے رہو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

بچوں نے بستے اور تختیاں ایک طرف رکھیں اور ان شاخوں کی مدد سے صفائی شروع کردی۔ کلاس رومز کی صفائی کے بعد انہوں نے برآمدے صاف کیے۔ اتنی دیر میں ساڑھے سات بج گئے۔ اسمبلی ہوئی اور بچے کلاسوں میں چلے گئے۔ ایک کلاس باہر برآمدے میں تھی۔

طاہر بچوں کو بلیک بورڈ پر لکھتے دیکھ رہا تھا، بولا "یہاں رائٹنگ سب کی بہت اچھی ہے۔"

"یہ تختی کا کمال ہے، جسے ہم فرسودہ قرار دے کر ترک کر چکے ہیں۔"

ہم نے سرمنون سے پروگرام پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ دوپہر میں وہ اسکول میں فرسٹ ایڈ کا مختصر تربیتی کورس کرائیں گے۔ "آج آپ لوگ اپنے طور پر تفریح کریں۔ انشاء اللہ کل جھیل چلیں گے۔ آج جیپ والوں سے بھی بات کرلی جائے گی۔ اور ہاں......... آج رات کیمپ فائر بھی ہے۔ میں نے کچھ آئٹم تیار کر کے دیئے ہیں۔ تم ذرا لڑکوں کو ریہرسل کرادینا" آخری جملہ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"بہتر سر۔"

ہم لوگ اسکول سے نکل آئے۔ "اب کیا پروگرام ہے؟" طاہر نے پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر دریا کے پار چل کر بیٹھتے ہیں۔ ویسے میں تو آج بہت مصروف رہوں گا۔ فرسٹ ایڈ میں سرمنون کی مدد کرانی ہے پھر کیمپ فائر کے لیے ریہرسل۔"

ہم پل کی طرف چل دیئے۔ اچانک دو مقامی بچے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ "صاحب جی، ایک روپیہ دونا......... صاحب جی" انہوں نے رٹ لگائی ہوئی تھی۔ طاہر نے جیب میں

ہاتھ ڈالا مگر میں نے اشارے سے منع کر دیا۔ بچے دریا تک پیچھے آئے پھر ہار کر چلے گئے۔

اس بار پل پار کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دریا کے اس طرف دو مقامی لڑکیاں بھینسیں چرا رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں آتے دیکھا تو گھونگٹ کاڑھ لیے اور بھینسوں کو ہنکا کر دور لے گئیں ہم ایک گول پتھر پر بیٹھ گئے۔ طاہر نے کہا "آپ نے پیسے دینے سے کیوں روک دیا مجھے؟"

"میں پہلی بار یہاں آیا تو میں نے اسی طرح کچھ بچوں کو پیسے دیئے تھے۔ اس پر مشتاق اعوان صاحب بہت خفا ہوئے تھے۔"

"ہیڈ ماسٹر صاحب؟ کیوں؟"

"ان کی بات معقول تھی۔ یہاں غربت بہت ہے۔ اعوان صاحب نے بتایا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے بچوں کو تعلیم پر راغب کرتے ہیں۔ ان کے لیے کیسے کیسے کتابوں کا بندوبست کرتے ہیں مگر اس سیزن میں ہم جیسے لوگ اگر غریب بچوں کو دو چار روپے بھی دے دیں تو وہ پڑھائی چھوڑ چھاڑ پورے سیزن لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرتے ہیں۔ اعوان صاحب کہتے ہیں' جس نے ہاتھ پھیلایا' وہ عزت نفس سے محروم ہو گیا اور جس نے عزت نفس گنوادی' وہ تعلیم کیا حاصل کرے گا؟"

"ٹھیک کہتے ہیں" طاہر نے کہا "واقعی اپنے پروفیشن سے بہت مخلص ہیں۔"

"ویسے یہاں اتنی غربت ہے کہ دل کانپتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھتے ہو' یہ علاقے ارضی جنت ہیں لیکن یہاں کی زندگی بہت سخت ہے۔ موسم بھی سخت ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جس استحصال کے نام پر ہمارے بڑے شہروں میں تشدد اور دہشت گردی ہو رہی ہے' اس سے زیادہ استحصال ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ یہاں کے بڑے لوگ کرتے ہیں۔ ہر آنے والی حکومت کرتی ہے۔ پورے ہزارہ میں لوگوں کو روزگار کے وسائل میسر نہیں۔ تبھی تو ارضی جنت کے یہ باسی روزگار کی تلاش میں شہروں میں کا رخ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کی آب و ہوا' خصوصاً گرمی انہیں پریشان کرتی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ہر شہر کے لوگ انہیں اپنی معیشت پر بوجھ بلکہ اپنے حق روزگار پر ڈاکا ڈالنے والا سمجھتے ہیں اور

ان کی مہمان نوازی کا یہ حال کہ دو وقت کے فاقے کے بعد سوکھی روٹی کھا رہے ہوں تو وہ بھی مہمان کو کھلادیں۔ کسی حکومت نے ان علاقوں کو وسائل فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ ٹورزم کے نکتہ نظر سے بھی ان علاقوں کو ترقی نہیں دی گئی۔ حالانکہ اس طرح کتنا زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے اور یہاں کے لوگ بھی خوش حال ہو سکتے ہیں۔ جانتے ہو' ۸۵ء میں یہاں بجلی نہیں تھی۔ ایسا گھپ اندھیرا ہوتا تھا کہ سچ مچ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ۸۸ء میں اپنی موت سے دو ماہ پہلے ضیاء الحق پہلے حکمراں تھے جو جھیل سیف الملوک تک آئے تھے۔ اس سے پہلے ہی بجلی پہنچانے کے انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ اس لیے اب یہاں بجلی موجود ہے۔ ضیاء الحق نے علاقے کو سہولتیں فراہم کرنے اور ترقی دینے کے لیے احکامات جاری کئے تھے مگر پھر وہ خود ہی نہ رہے۔ یہاں تو بھائی جو کچھ ہے' زیادہ تر انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ یہاں تو استحصال اور زیادتی اس درجے کی ہے کہ جی چاہتا ہے' اپنے شہر والوں کو یہاں لاؤں اور دکھاؤں کہ تم جس استحصال اور حق تلفی کے نام پر ایجی ٹیشن کرتے ہو' نفرت کی سیاست کرتے ہو' وہ یہاں والوں کے دکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ارے استحصال کے خلاف لڑنا ہے تو پورے پاکستان کے عوام کے لیے لڑو۔ پورے پاکستان کے غریب عوام کو ساتھ لے کر لڑو۔ غریبوں سے کیوں لڑتے ہو' جو تم سے زیادہ دکھی ہیں۔ تمہارے پاس جو شعور ہے' وہ استحصال کے مارے ہوئے تمام ہم وطنوں کو دو۔ انہیں بتاؤ کہ مٹھی بھر استحصالی طبقہ انہی کے ووٹوں سے مسند اقتدار پر بیٹھتا ہے ....اپنے اور اپنے جیسوں کا پیٹ بھرنے اور عوام کا خون چوسنے کے لیے۔" میں کہتے کہتے رکا اور گہری سانس لی۔ "مگر سب بے کار ہے۔ چھوڑو یار۔ یہاں لوگ بے شعور ہیں ....بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہو گئے۔ کوئی کسی کو کیا سمجھائے۔"

دیر تک خاموشی رہی۔ ماحول بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد طاہر نے کہا "واقعی.........یہ تو ہے لیکن جو شخص اپنے شہر سے نکلا ہی نہیں' جس نے یہ سب کچھ دیکھا ہی نہیں' وہ کیسے سمجھ سکتا ہے؟"

"نہیں یار۔ ایسے لوگ بھی ہیں' جو دیکھتے ہیں تب بھی انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ تفریح کے لیے آنے والے تفریح کر کے چلے جاتے ہیں۔ جنہیں یہ فکر لگی رہتی ہو کہ ہم گھر کی تمام آسائشوں سے محروم ہو گئے' انہیں دوسروں کے دکھ کیا نظر آئیں گے' نہ انہیں دوسروں کی پروا ہوتی ہے۔"

پھر دیر تک خاموشی رہی۔ ہم بپھرے ہوئے دریا کی متلاطم لہروں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے موضوع بدلا۔ "تم ذرا ناران میں گھومو پھرو آج۔ یہاں لوگ تمہیں وہ غار بھی دکھائیں گے' جہاں شہزادہ سیف الملوک کو قید کیا گیا تھا۔ اسی غار میں بیٹھ کر سیف الملوک کی کہانی سننا۔ مزہ آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اور کوئی تفریح؟"

"اور کچھ نہیں۔ جی چاہے تو ادھر ادھر کے کسی پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنا مگر زیادہ اوپر نہ جانا۔ وقت کم ہو گا تمہارے پاس۔" پھر میں نعیم کی طرف مڑا۔ "یار' کچھ کچے اخروٹ تو توڑو۔ کل طاہر کے دانت چمکائیں گے۔"

"ابھی جاتے ہوئے لے چلیں گے۔" نعیم نے کہا۔

"دانت چمکانے کا کیا مطلب ہوا؟"

"کچے اخروٹ کا اوپر کا ہرا حصہ ذرا سا لے کر دانتوں پر رگڑو گے تب دانت اتنے چمکیں گے کہ حیران ہو جاؤ گے۔ بس ہونٹوں کو بچانا۔ بہت تیز ہوتا ہے کچا اخروٹ۔"

"اب چلا جائے؟" نعیم نے کہا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆============☆============☆

رات کا کیمپ فائر بہت کامیاب رہا۔ ناران کے طلباء اور اسکاؤٹس نے بھی اس میں شرکت کی۔ علاقے کے لوگ بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ قومی نغمے سنائے گئے۔ قومی یک جہتی کے موضوع پر ہمارے اسکاؤٹس نے کئی آئٹم پیش کئے جو بہت پسند کئے گئے۔ آخر میں الجدت اسکاؤٹس کی طرف سے انعامات تقسیم کیے گئے۔ اگلے روز جھیل سیف الملوک کا پروگرام تھا۔ صبح سویرے صائمہ ہم لوگوں کی طرف چلی آئی "نعیم سنیں۔ یہ جھیل کا راستہ بہت خطرناک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پورا راستہ کچا ہے اور ایک گلیشیر کے علاوہ دو موڑ ایسے ہیں۔ اتنے تنگ کہ فور وہیل ڈرائیو جیپ ہی کام دکھاتی ہے اور جیپ کو بھی ان مقامات پر کئی بار آگے پیچھے ہونا پڑتا ہے۔"

"اور پیدل راستہ کیسا ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک ہے۔ بہت لوگ پیدل جاتے ہیں۔ راستے میں آپ کو نہ جانے کتنے لوگ ملیں گے۔ ویسے گائیڈ بھی ہوتے ہیں۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں تو پیدل ہی جاؤں گی۔"

"یہ بھی سر پھری لڑکی ہے" اس کے جانے کے بعد طاہر نے تبصرہ کیا پھر مجھ سے بولا "آپ سے بہت خفا معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

ہم لوگ گزشتہ رات ہی جیپ کے لیے بات کر چکے تھے۔ یہاں پرانے زمانے کی جیپیں اب تک چل رہی تھیں۔ جیپ میں آٹھ افراد تک کی گنجائش ہوتی ہے۔ جھیل

تک پہنچانے اور واپس لانے کے چار سو روپے لیتے ہیں۔ ہم چھ افراد نے ایک جیپ کرلی تھی۔ سرمنون' میں' طاہر' نعیم' سائرہ اور راحیلہ۔

ناران سے جھیل سیف الملوک کا فاصلہ کوئی......... چھ ساڑھے چھ کلو میٹر ہے مگر اس فاصلے کے ساتھ بلندی کے دو ہزار فٹ بھی شامل ہیں۔ پھر راستہ کچا اور بہت خراب ہے۔ راستے میں ایک گلیشیر بھی ہے' جس کو عبور کرنا جیپ کے لیے ایک کارے دارد ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیپ کے لیے گلیشیر کو عبور کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے میں گلیشیر کے دونوں طرف جیپیں ہوتی ہیں .... ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر۔ مسافر جیپ سے اتر کر گلیشیر پار کرتے ہیں اور ادھر والی جیپ میں جا بیٹھتے ہیں۔ واپسی میں بھی یہی ہوتا ہے۔

ہم لوگ دس بجے جھیل کے لیے روانہ ہوئے۔ بیس منٹ بعد گلیشیر پر پہنچ گئے۔ وہاں ہم سب جیپ سے اتر گئے۔ یہ بہت بڑا گلیشیر ہے۔ جیپ کو گلیشیر پار کرانے کے لیے اس کے راستے پر درختوں کی چھوٹی ٹہنیاں بچھانی پڑتی ہیں۔ تب بھی جیپ رینگ رینگ کر گلیشیر پار کرتی ہے۔ کبھی پہیے برف میں دھنس کر بے سود گھومتے ہوئے برف کے چنگل سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں.........اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب جیپ فور وہیل پر ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ جیپ کے پھسلنے کا خطرہ الگ ہوتا ہے۔

ڈرائیور اور اس کا مددگار اس کام میں جت گئے۔ ہم لوگ گلیشیر پر تفریح کرتے اور تصویریں بناتے رہے۔ ہم نے دھوپ کے چشمے پہن لیے تھے۔ گلیشیر پر جب دھوپ پڑ کر منعکس ہوتی ہے تو اس کی چمک آنکھوں کے لیے بے حد مضر بھی ثابت ہوسکتی ہے۔اس لیے یہ احتیاط ضروری ہے۔

جیپ نے گلیشیر پار کرلیا تو ہم لوگ جیپ میں سوار ہوئے اور سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگیا۔ یہ وہ سفر ہے کہ جس میں لوگ عام طور پر سانس بھی آہستہ لیتے ہیں' اور خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ کچا راستہ اتنا تنگ ہے کہ بعض مقامات پر دو جیپیں نہیں گزر سکتیں۔ جس ایک کے پاس گنجائش ہوتی ہے' وہ پیچھے ہٹ کر اور سائڈ پکڑ کر پہلے دوسری

جیپ کو جانے کا موقع دیتی ہے۔ ایک طرف پہاڑی دیوار ہوتی ہے تو دوسری طرف اتنی گہری کھائی کہ دیکھتے ہوئے بھی خوف آئے۔

پہلا خطرناک موڑ آیا تو ہم نیچے اتر آئے۔ میں نے طاہر سے کہا "اب اس پورے عمل کو دیکھو اور ڈرائیور کو داد دو۔"

وہ انگریزی حرف U کی شکل کا موڑ تھا۔ ڈرائیور پہلے جیپ کو سامنے آخری حد تک لے کر گیا.........اتنا کہ جیپ کے اگلے پہیوں سے صرف ایک انچ آگے کھائی کا مہیب خلا تھا پھر اس نے ریورس کرتے ہوئے گاڑی کو کاٹا۔ پھر دوبارہ آگے لے کر گیا پھر ریورس کر کے کاٹا۔ اس دوران جیپ کے پچھلے پہیے تقریباً کھائی کے خلا میں پہنچ رہے تھے۔ طاہر جھرجھری لے کر رہ گیا لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

تیسری بار ریورس کرنے کے نتیجے میں جیپ ٹرن لینے کے قابل ہوگئی۔ ہم پھر جیپ پر سوار ہوگئے۔

پھر دوسرا موڑ آیا۔ یہ موڑ اور خطرناک ہے۔ یہ موڑ مڑتے ہی چڑھائی آتی ہے۔ میں نے طاہر سے کہا۔ "اب رکنے کی ضرورت نہیں" ہم سب اس چڑھائی پر چل دیئے۔

چڑھائی پر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر آپ کی نظر داہنی جانب اٹھتی ہے اور آپ کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوتی ہیں۔دل میں ایک عجیب سی خوشی امنڈتی ہے' جس میں سپردگی و وارفتگی بھی ہوتی ہے اور شکر بھی۔

میں پانچ بار جھیل جاچکا ہوں لیکن اب بھی ایسا لگتا ہے جیسے جھیل کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ جھیل نظر آئی تو قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔سب کا یہی حال تھا۔ اس نظارے کا کوئی بدل نہیں ۔ اس بلندی سے پُرسکون جھیل انگوٹھی میں جڑے نگ کی طرح لگ رہی تھی۔ بہت جی چاہتا ہے کہ اس بے پناہ حسن کو بیان کیا جائے لیکن بیان کرنے بیٹھو تو لفظ ہیچ لگنے لگتے ہیں۔ ہر پیرایہ اظہار ناقص معلوم ہوتا ہے۔ سو آدمی صرف اپنی کیفیت بیان کرسکتا ہے اور وہ بھی ناتمام۔

اس پہلی نظر کے بعد میں یوں مبہوت ہوا کہ جھیل کے سوا کسی چیز کا احساس نہیں

رہا۔ نہ گرد و پیش کا، نہ اپنے ساتھیوں کا۔ میں اس بے تابی کو بھی بیان نہیں کر سکتا، جس سے میں جھیل کو تک رہا تھا۔ بس ایسا تھا، جیسے نظروں کے ذریعے جھیل کو پی جانا.........اپنے اندر بھر لینا چاہتا تھا۔

پھر اچانک میں نے ڈھلوانی راستے پر تیزی سے بھاگنا شروع کیا۔ راستے میں وہ چھوٹا سا دہانہ ہے، جس سے جھیل کا پانی مستقل طور پر باہر نکلتا رہتا ہے۔ بہاؤ کافی تیز ہوتا ہے، اس سے گزر کر میں جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ خوش رنگ مگر شفاف جھیل اپنے گرد کے ہر منظر کا عکس سجائے ہوئے تھے۔ پُرسکون ایسی کہ لہر تو کجا، پانی ہلتا تک نہیں دکھائی دیتا۔ کوئی عکس نہیں ٹوٹتا۔ کوئی تصویر نہیں بکھرتی۔

جھیل کے سحر کے ابتدائی حملے سے سنبھلتے سنبھلتے آدھا گھنٹا لگا پھر ہمیں اپنا اور ایک دوسرے کا ہوش آیا۔ ہم یکجا ہوئے۔ جھیل کے سامنے ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ ریسٹ ہاؤس اور جھیل کے درمیان سرسبز مسطح زمین کا وسیع و عریض قطعہ ہے۔ اس میں دنیا کے خوبصورت ترین اور نازک ترین پھول کھلتے ہیں۔ اتنے نازک پھول کہ ادھ کھلی نازک کلیاں بھی اپنی نزاکت اور پاکیزگی بھول کر انہیں تکتی رہیں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ وہ پھول نہیں، پریاں ہیں، جو رات کو جھیل کے کنارے ناچتی گاتی کھیلتی ہیں اور صبح ہوتے ہی پھول بن جاتی ہیں۔

جھیل، اس کی فضا، اس کا ماحول اتنا طلسماتی ہے کہ کیسی ہی بعید از عقل کہانی اس سے منسوب کر کے سنا دیں، آدمی کم از کم جھیل کی حدود میں اس پر یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خواہ بعد میں وہ اسے افسانہ ہی لگے اور وہ اپنے یقین کرنے پر شرمسار ہو لیکن وہی شخص دوبارہ آئے اور جھیل کے سامنے بیٹھ کر وہ پھول توڑتے ہوئے وہی کہانی سنے تو قوی ترین امکان ہے کہ وہ پھر اس پر یقین کر لے گا۔ جادو وہی ہے جو سر چڑھ کر بولے۔

طاہر نے اپنی ڈائری نکال لی تھی۔ راحیلہ اسے پھول توڑ کر دے رہی تھی اور وہ انہیں ڈائری کے صفحات کے درمیان رکھتا جا رہا تھا۔ ایک طرف سائرہ عجیب عجیب مگر بے حد خوبصورت اور رنگ برنگے پتھر جمع کرنے میں مصروف تھی۔ کچھ لڑکوں نے کرکٹ

شروع کر دی تھی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ کھو کھو کھیلنے میں مصروف تھا۔

ڈیڑھ بجے سر ممنون نے کھانا لگوا دیا۔ سرسبز مسطح زمین پر دریاں بچھا دی گئیں۔ حسین بخش نے بریانی بہت اچھی پکائی تھی۔ سبھی نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اتنی اچھی طرح کھانے کے بعد چائے کی شدید طلب ہوتی ہے۔ پیچھے کچھ جھگی ہوٹل ہیں۔ وہاں چائے کے علاوہ پکوڑوں اور بسکٹوں کا بندوبست بھی تھا۔ ہم لوگ بہرحال ڈٹ کر کھانا کھا چکے تھے دل تو چاہ رہا تھا لیکن پکوڑوں کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم نے چائے طلب کی۔ ایک پیالی سے گزارہ نہ ہوا تو دوسری پیالی منگوائی۔

"پیٹ بہت بھر گیا ہے۔ کچھ دیر تو یہاں سے ہلا ہی نہیں جائے گا۔" طاہر نے کہا۔

"تو کیا مضائقہ ہے۔ چارپائی پر لیٹ جاؤ۔ یہ چارپائیوں والے ہوٹل اس لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔" نعیم بولا۔

"ہاں... لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر آرام کر لو۔ جیپ تو پانچ بجے آئے گی۔ ابھی تو سوا دو بجے ہیں۔"

ہم تینوں ہی نے ٹانگیں پھیلا دیں۔ "اب پروگرام کیا ہے؟" طاہر نے پوچھا۔

"جھیل کا پورا چکر لگائیں گے۔" میں نے اشارے سے بتایا۔ "اس طرف سے جائیں گے اور ادھر سے واپس آئیں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟"

"ممکن تو ہے۔ البتہ گلیشیرز کی وجہ سے خطرناک ہے" نعیم نے کہا۔ "جب بھائی جان پہلی بار آئے تو انہوں نے کہا کہ جھیل کا چکر لگائے بغیر کیا لطف آئے گا۔ اس سے پہلے ہم میں سے کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا تھا۔ بہت سے لوگ تو اب بھی ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ لطف آجائے گا۔ یہ تو زبردست ایڈونچر رہے گا۔"

تین بجے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیسے دے کر باہر آئے تو موسم کی تبدیلی کا احساس ہوا۔ خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ آسمان پر گھٹا تلی کھڑی تھی۔ جھیل کے کنارے پر آئے۔ اسی

وقت بائیں سمت والے پہاڑ سے کچھ لوگ اترتے نظر آئے۔ انہوں نے کسی کو اٹھایا ہوا تھا۔ وہ قریب آئے تو پتا چلا کہ چار آدمی ایک بیمار کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ وہ اس طرف ایک چھوٹے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے بیمار کو چھو کر دیکھا۔ وہ بخار میں جل رہا تھا۔

نعیم جا کر سر ممنون کو لے آیا۔ انہوں نے مریض کا حال دیکھا' فرسٹ ایڈ باکس سے دوا دی لیکن تاکید کی کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جائیں۔ یہاں ٹرانسپورٹ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ وہ لوگ پیدل سفر کرنے کے عادی تھے لیکن بیمار کی حالت ایسی نہیں تھی۔

پھر غیر متوقع طور پر ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جیپیں واپس لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔

"تمہیں پانچ بجے آنا تھا۔" سر ممنون نے ہماری جیپ کے ڈرائیور سے کہا۔

"دیکھو صاب........ موسم خراب ہو رہا ہے۔ آپ لوگ ہماری ذمے داری ہو لیکن ہم یہاں کا موسم سمجھتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد جیپ کا سفر ممکن نہیں رہے گا۔"

سر ممنون نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا لیکن میں خاموش رہا۔ میرا بولنا مناسب نہیں تھا۔

"سر........ ہم تو ابھی جھیل کا چکر لگائیں گے۔" طاہر بولا۔

"اس موسم میں یہ مناسب نہیں۔" سر ممنون نے اسے سمجھایا۔ "پھر جیپ چلی گئی تو اس موسم میں پیدل سفر کرنا پڑے گا۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔"

"ہاں صاب۔" ڈرائیور طاہر سے مخاطب ہو گیا۔ "ادھر دن بھر دھماکوں کی آوازیں نہیں سنیں آپ نے؟ پہاڑوں پر ڈائنامیٹ لگائے جا رہے ہیں' نئے رستے بنانے کے لیے۔ راستے میں پہاڑوں کے پتھر پھیلے ہوئے ہیں۔"

میں اب بھی خاموش تھا۔ دوسری جیپیں ہماری پارٹی کے لوگوں کو لے کر روانہ ہونے لگی تھیں۔

"نہیں سر' آپ فکر نہ کریں۔ پھر اس کے بعد جانے کب یہاں آنے کا موقع ملے۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔" طاہر نے کہا اور تائید طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ٹھیک ہے سر۔" میں نے کہا۔ "آپ سائرہ اور راحیلہ کو لے جائیں اور ہاں........ ساتھ ان لوگوں کو بھی لے جائیں۔ بیمار کا بھلا ہو جائے گا۔"

سر ممنون ہمارے ایڈونچر کے حق میں نہیں تھے لیکن ہمارا ارادہ مستحکم دیکھ کر مان گئے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو جیپ میں بیٹھنے کو کہا پھر دو جیپوں میں سائرہ اور راحیلہ کو ایڈجسٹ کرایا تاکہ بیمار کو لٹایا جا سکے۔ اچانک ان کی نظر صائمہ پر پڑی۔ "بیٹے........ تم نہیں گئیں؟ تم کس جیپ میں آئی تھیں؟"

"میں پیدل آئی تھی سر اور پیدل ہی جاؤں گی۔" صائمہ نے جواب دیا۔

"اور تمہارے کزن؟"

"وہ جیپ میں آئے تھے اور چلے بھی گئے۔"

سر ممنون نے بہت اصرار کیا کہ صائمہ ان کے ساتھ جائے لیکن وہ نہ مانی۔ "بہت بری بات ہے صائمہ۔ تم میری ذمے داری ہو۔" سر ممنون نے جھنجلا کر کہا۔

"یقین کریں سر........ میں انجوائے کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس شرط پر تمہیں چھوڑ رہا ہوں کہ تم ان لوگوں کے ساتھ رہو گی۔" سر ممنون نے کہا پھر وہ میری طرف مڑے۔ "ظفر........ صائمہ کو میں تمہاری ذمے داری پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"ان سے اس بات کی تصدیق کرا دیں سر۔" میں نے کہا۔ "ناران پہنچنے تک یہ من مانی نہیں کریں گی۔"

سر ممنون نے صائمہ کی طرف دیکھا۔ صائمہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

آخری جیپ بھی چلی گئی تو ہم نے اپنے ایڈونچر کا آغاز کیا۔

جھیل سیف الملوک تین طرف سے مکمل طور پر پہاڑوں سے گھری ہوئی پیالے کی شکل کی جھیل ہے۔ چوتھی سمت وہ ہے' جہاں جھیل سے پانی کا مسلسل اخراج ہوتا رہتا

ہے۔ اس دہانے کی مخالف سمت برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ وہاں دو پہاڑوں کے درمیان سے پگھلی ہوئی برف کے کئی نالے بہتے ہوئے آتے ہیں اور جھیل میں گرتے ہیں۔ یہی نالے جھیل کی Source ہیں۔ ان میں کوئی نالہ بھی زیادہ چوڑا نہیں لیکن بلندی سے آنے کی وجہ سے ان کا بہاؤ خطرناک حد تک تیز ہوتا ہے اور پانی ٹھنڈک کے اعتبار سے برف سے کسی طرح کم نہیں۔ جھیل کے دونوں پہلوؤں والے پہاڑوں پر مجموعی طور پر اس وقت پانچ گلیشیر موجود تھے۔ دو اس جانب' جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا اور تین اس کی مخالف سمت۔

خوش قسمتی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم بیس پچیس قدم گئے ہوں گے کہ اچانک بادل چھٹ گئے اور ہلکی ہی سہی مگر دھوپ نکل آئی ورنہ گھٹا چھائی ہو اور روشنی کم ہو تو جھیل کی خوبصورتی اور سحرانگیزی برقرار تو رہتی ہے مگر وہ ایسی پُرہیبت ہو جاتی ہے کہ خوف سا طاری ہونے لگتا ہے۔

کوئی پانچ منٹ چلنے کے بعد ہم پہلے گلیشیر پر پہنچ گئے۔ طاہر نے گلیشیر کو دیکھا اور جھرجھری لے کر رہ گیا۔ ”ظفر بھائی.......... ایڈونچر توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔“

جھیل کے گرد والے گلیشیر اس اعتبار سے بہت زیادہ خطرناک ہیں کہ وہ جھیل کے پانی میں اترے ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ عام گزرگاہ نہیں' اس لیے ان پر بنی ہوئی پگڈنڈیاں پکی نہیں ہیں۔ ”چکر لگانا کوئی فرض نہیں ہے۔“ میں نے طاہر سے کہا۔ ”ہم واپس چلے چلتے ہیں۔ ناران تک کا سفر بھی ایڈونچر ہی ہوگا۔“

”نہیں ظفر بھائی' چکر تو اب لگے گا۔“

”بس تو بہت سنبھل کر چلنا۔ توازن قائم رکھنا۔ کہیں دشواری محسوس ہو تو بیٹھ جانا۔“

ہم نے گلیشیر کا سفر شروع کیا۔ نعیم سب سے آگے اور میں سب سے پیچھے تھا۔ نعیم کے پیچھے طاہر اور میرے آگے صائمہ۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ یہاں پاؤں پھسلنے کا مطلب جھیل میں گرنا تھا اور اس کا تصور ہی رگوں میں خون کو منجمد

کرنے کے لیے کافی تھا۔

گلیشیر عبور کرنے میں ہمیں سات منٹ لگے۔ حالانکہ گلیشیر کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی۔ طاہر کو دوبارہ چند قدم بیٹھ کر چلنا پڑا۔ صائمہ البتہ بڑے اعتماد سے چل رہی تھی۔

گلیشیر عبور کرنے کے بعد ہماری رفتار تیز ہوگئی۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب دوڑا جائے۔ راستے کی ایک بڑی رکاوٹ دور ہوگئی تھی۔

چار منٹ بعد ہم دوسرے گلیشیر پر پہنچے۔ وہ نسبتاً آسان ثابت ہوا۔ اب اس طرف کوئی گلیشیر نہیں تھا۔ ہم بدستور اسی ترتیب سے چل رہے تھے۔ اس سمت کی مسافت طے کر کے جب ہم اس مقام پر پہنچے' جہاں سے جھیل کے گرد گھومنا تھا تو خلاف توقع ایک بہت بڑا مسئلہ ہمارے سامنے تھا۔

اوپر سے آنے والے نالوں میں اس بار پانی زیادہ تھا۔ لہٰذا کئی پتلے پتلے نالے یکجا ہو کر دو چوڑے نالوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ پانی ڈیڑھ فٹ سے کم ہی گہرا تھا لیکن بہاؤ بہت تیز تھا۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا۔ پہلا نالہ کوئی تیس فٹ چوڑا تھا۔ اس کے برابر پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر دوسرا نالہ تھا۔ اس کی چوڑائی اٹھارہ بیس فٹ ہوگی۔

مسئلے کی سنگینی سے میں اور نعیم تو واقف تھے لیکن طاہر اور صائمہ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ”کیا ہوا۔ رک کیوں گئے آپ لوگ؟“ صائمہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”رک جاؤ صائمہ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ تاہم وہ رک گئی تھی۔ ”کیوں مسئلہ بنا رہے ہیں۔ نہ تو پانی زیادہ گہرا ہے نہ ہی فاصلہ زیادہ ہے۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ سر ممنون تمہیں میری ذمے داری پر چھوڑ کر گئے ہیں۔“

”تو میں اس سے انکار کب کر رہی ہوں۔“ خلاف توقع اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

طاہر نے کہا کچھ نہیں لیکن اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ صائمہ سے متفق ہے۔

میں نے صائمہ سے کہا "تم پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھو۔"

صائمہ بیٹھی اور اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا مگر فوراً ہی ہاتھ باہر کھینچ لیا پھر وہ اٹھی اور ہماری طرف چلی آئی۔

"ہاں بھئی' کیا کیا جائے؟" میں نے نعیم سے پوچھا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" طاہر سے نہ رہا گیا۔

"صائمہ سے پوچھو۔" میں نے کہا۔

طاہر نے صائمہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "پانی بہت ٹھنڈا ہے.......... ناقابل برداشت اور بہاؤ بہت تیز ہے۔"

"بہاؤ تیز ہے؟" طاہر نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں.......... اتنا تیز ہے کہ تمہیں کھینچ کر جھیل میں لے جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال اب ہم پلٹ کر جانے سے تو رہے۔ چلو بھئی' جوتے اور موزے اتار دو۔"

"پانی اتنا ہی ٹھنڈا ہے تو جوتے موزے اتارنا تباہ کن ہوگا۔" طاہر نے اعتراض کیا۔

"لیکن نہ اتارنا مہلک ہوگا۔" میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ "جوتوں میں پانی بھر جائے گا۔ موزے گیلے ہو جائیں گے۔ ابھی ہمیں تین.......... بلکہ چار گلیشیر پار کرنے ہیں پھر ناران تک کا سفر ہے۔ نمونیا سے کم پر نہیں ٹلے گا یہ معاملہ۔"

طاہر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بات اب اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ پھر بھی وہ آگے بڑھا اور اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ وہ اٹھ کر پلٹا تو اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے نسبتاً زیادہ دیر پانی میں ہاتھ رکھا تھا۔

نعیم سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا۔ "بھائی جان۔ بیلٹس کام آئیں گی۔"

"گڈ آئیڈیا۔ لیکن یار' ہم تینوں کی بیلٹس مل کر بمشکل بارہ فٹ بنیں گی۔"

نعیم نے سب کی جیکٹوں کو دیکھا۔ "دو جیکٹیں بھی ہیں بیلٹ والی۔"

"یہ اٹھارہ بیس فٹ ہو گیا۔ مسئلہ تو پھر بھی حل نہیں ہوتا۔"

"میرے ہینڈ بیگ میں موٹی ڈوری بھی ہے۔" اچانک صائمہ نے کہا۔

"کیسی ڈوری؟"

"رسی کودنے کے کام آتی ہے۔" صائمہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"بس تو نکالو۔ بات بن گئی۔"

پانچ بیلٹس اور ڈوری مل کر ہماری ضرورت سے زیادہ ہی بن گئی۔ اسے خوب کھینچ کر اس کی مضبوطی کو آزمایا گیا پھر میں نے طاہر اور صائمہ سے کہا۔ "یہ شفاف پانی میں چھوٹے گول کنکر دیکھ رہے ہو' یہ بڑے ظالم ہیں۔ ٹھنڈے پانی میں تو ایسا لگے گا کہ یہ تلووں میں گھسے جا رہے ہیں۔ ان کے لیے خود کو تیار رکھنا۔ پانی سے نکلتے ہی پیروں کو ہاتھوں سے زور زور سے رگڑنا۔" پھر میں نعیم سے مخاطب ہوا۔ "ترتیب وہی رہے گی۔"

نعیم نے بیلٹ کا ایک سرا کلائی سے باندھا۔ دوسرے ہاتھ میں اپنا بیگ لیا اور پانی میں اتر گیا۔ اس کے چلنے کے انداز سے اس کی تکلیف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دو تین بار وہ لڑکھڑایا اور ایسا لگا کہ اس کے قدم اکھڑ جائیں گے مگر وہ سنبھل گیا۔ میں رسی کا دوسرا سرا تھامے تیار کھڑا تھا۔ ضرورت پڑتی تو مجھے طاہر سے بھی مدد مل سکتی تھی۔

نعیم کے اس طرف پہنچنے کے بعد طاہر نے تیاری کی لیکن میں نے اسے روک دیا۔ صائمہ کا پہلے جانا بہتر تھا۔ اس کے قدم اکھڑ سکتے تھے۔ سنبھالنے کے لیے دو آدمیوں کا ہونا بہتر تھا۔ نعیم نے بیلٹ ہماری طرف اچھالی۔ میں نے بیلٹ تھام کر صائمہ کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

صائمہ نے جس طرح پانی کو عبور کیا' اس سے میں اس کی جسمانی و اعصابی مضبوطی کا قائل ہو گیا۔ اس نے جلد بازی نہیں کی تھی۔ تکلیف کے باوجود قدم جما کر رکھنے کو زیادہ اہمیت دی تھی۔ البتہ دوسری طرف پہنچتے ہی وہ زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے

پیروں کو رگڑنے لگی تھی۔

دوسرا نالہ نسبتاً آسان تھا۔ اسے پار کرنے کے بعد ہم چاروں زمین پر بیٹھ گئے۔ طاہر اور نعیم کے بیگوں میں تولیے تھے۔ ایک تولیا صائمہ کے پاس بھی تھا۔ میرے کہنے پر ان تینوں نے اپنے پاؤں تولیوں میں اچھی طرح لپیٹ لیے اور زور زور سے ملتے رہے۔ میں نے اپنے پیروں کو گرم جیکٹ میں چھپا لیا تھا۔ ایک طرف ٹھنڈے پانی کی وجہ سے ہمارے پیروں کے ناخن اور انگوٹھوں اور انگلیوں کی پوریں نیلی پڑ گئی تھیں۔ دوسری طرف احساس ہوتا تھا کہ تلووں میں کنکروں نے سیکڑوں زخم بنا ڈالے ہیں۔

پندرہ منٹ تک ہم پیروں کو گرم کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر ہم نے جوتے اور موزے پہن لیے۔ سوکھے موزے اور خشک جاگرز اس وقت بہت بڑی نعمت معلوم ہوئے تھے۔ اب دوسری جانب کا سفر شروع ہوا۔ تین گلیشیر درپیش تھے۔ جبکہ ہم پہلے کی نسبت کمزور اور مضمحل تھے۔ بہرکیف کسی خاص دشواری کا سامنا کیے بغیر ہم وہاں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ ہم فوراً ایک جھگی ہوٹل میں گھس گئے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی.......... اور چائے کی تو اس وقت ضرورت تھی۔

"لو بھئی.......... ایک ایڈونچر تو مکمل ہو گیا۔" میں نے کہا پھر گھڑی دیکھی۔ پونے پانچ بجے تھے۔ "ڈیڑھ گھنٹا لگا چکر لگانے میں۔ پہلی بار.......... پانچ سال پہلے ہم نے صرف ۲۵ منٹ میں چکر لگایا تھا۔ اس وقت جھیل پر گلیشیر صرف ایک تھا اور پہاڑی نالوں کا ایسا مسئلہ نہیں تھا۔"

"اس وقت تو آپ کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہے۔" طاہر بولا۔

"خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"جوتے اور موزے خشک اور گرم نہ ہوتے تو مجھے تو اس وقت تک نمونیا ہو چکا ہوتا۔ ابھی تک پیروں سے سردی چڑھ کر پورے جسم میں دوڑ رہی ہے۔"

"پکوڑے کھاؤ گے، دو تین پیالیاں چائے پیو گے تو فٹ ہو جاؤ گے۔"

چھ بجے قدرے تازہ دم ہو کر ہم باہر نکلے اور ناران واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس

پیدل سفر میں کئی پہاڑوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ جھیل سیف الملوک سطح سمندر سے ساڑھے دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ یعنی ناران سے دو ہزار فٹ اوپر۔ واپسی کے سفر میں چڑھائی کم ہے اور اتار زیادہ ہے اور پہاڑ سے اترنا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ہم راستے میں تھے کہ گھٹا پھر چھا گئی۔ "دعا کرو کہ بارش نہ ہو۔" میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب ہم جس پہاڑ سے اتر رہے تھے، اس کی مٹی ڈائنامائٹ کی وجہ سے بھربھری ہو گئی تھی۔ پھسلنے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ ادھر اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ نیچے بہت نیچے دریائے کنہار چنگھاڑ رہا تھا۔ شفاف پانی کے نیچے پڑی مہیب چٹانیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں سب سے آگے تھا۔ میرے پیچھے صائمہ، پھر طاہر اور آخر میں نعیم۔

ہم پہاڑ کے بیچوں بیچ ہوں گے کہ وہ خوفناک حادثہ رونما ہوا۔

بھربھری مٹی کی وجہ سے ویسے ہی قدم سنبھال کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ پھر ڈھلوان بہت سیدھی اور خطرناک تھی اور پگڈنڈیاں، بہت تنگ، کہیں کہیں جنگلی جھاڑیاں تھیں اور خود رو گھاس تو تقریباً پورے پہاڑ پر موجود تھی۔ پہاڑ پر چڑھنا نسبتاً آسان اس لیے ہوتا ہے کہ چڑھتے ہوئے قدرتی طور پر جسم بے حد متوازن پوزیشن میں ہوتا ہے۔ جبکہ اترتے ہوئے معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ جسم پورے طور پر متوازن نہیں ہوتا اور ایک جھٹکا توازن بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

نیچے دو پہاڑوں کے درمیان ایک بے حد تنگ گھاٹی تھی، جس میں غصہ ور دریائے کنہار بہہ رہا تھا۔ اس کی دہاڑیں خوفناک تھیں اور پانی کے چھینٹے دور تک اڑ رہے تھے۔ شاید وہ گزرگاہ کی تنگی کی وجہ سے زیادہ ہی مغلوب الغضب ہو رہا تھا۔ بہرحال اس پُرسکوت ماحول میں اس کی دہاڑیں دل پر ہیبت طاری کر رہی تھیں۔

اچانک میرے اگلے پیر کے نیچے سے وہ پتھر نکل گیا، جس پر میں نے پاؤں جمایا تھا۔ حالانکہ میں نے پورا بوجھ ڈالنے سے پہلے اس پر پاؤں رکھ کر چیک کیا تھا کہ پتھر ہلا ہوا تو نہیں ہے لیکن پتھر شاید اندر سے ہلا ہوا تھا۔ میرا بوجھ پڑتے ہی وہ نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور میں بھی لڑھکنے لگا۔

وہ چند ثانئے ایسے تھے کہ ان میں موت کے سوا کسی خیال کی گنجائش نہیں تھی.......... اور موت بھی کیسی خوفناک۔ اتنی بلندی سے لڑھکتے ہوئے گرنا.......... اور وہ بھی تنگ گھاٹی میں بہتے ہوئے خوں خوار دریا میں گرنا' جس میں ڈوبی ہوئی مہیب چٹانیں لوہے کو بھی پاش پاش کر دیں۔ میں صرف یہ خواہش کر سکتا تھا کہ کاش لڑھکنے کے دوران ہی مرجاؤں۔ دریا کا یخ بستہ پانی میری موت کا باعث نہ بنے۔

اچانک میرا لڑھکتا ہوا جسم ٹھہر گیا.......... لٹک گیا۔

پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ یقینی موت کے احساس سے شل ذہن کچھ سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا مگر لڑھکنا موقوف ہوا تو زندگی کی خواہش جاگی اور ذہن نے ہیجانی کیفیت میں کام کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ پہاڑی خود رو گھاس کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ اس نے گوہ کی طرح پہاڑ کے سینے کے اندر پنجے گاڑے ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ کتنی کمزور لگتی ہے اور وقت پڑنے پر کتنی مضبوط ثابت ہوتی ہے.......... عورت کی طرح!

بے بسی کے عالم میں لڑھکتے ہوئے میں ہاتھ چلا رہا ہوں گا اور گھاس میرے ہاتھ میں آگئی ہوگی۔ اب میں اس گھاس کو تھامے لٹک رہا تھا۔ پیر ٹکانے کو جگہ میسر نہیں تھی بلکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے پیروں کے نیچے کتنے فاصلے پر پاؤں ٹکانے کی جگہ ہے.......... اور ہے بھی یا نہیں۔ نیچے سے دریائے کنہار کی چنگھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب انہیں سن کر ایسا لگ رہا تھا کہ دریا اس بات پر غیظ و غضب کا اظہار کر رہا ہے کہ شکار اس کی طرف آتے آتے رک کیوں گیا۔

میں جانتا تھا کہ موت یقینی ہے۔ گھاس کے ٹوٹنے کا امکان دور کا تھا۔ سامنے کی بات یہ تھی کہ گھاس میرے ہاتھوں سے چھوٹی جا رہی تھی۔ میری ہتھیلیاں پسیجنے لگی تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ میں گھاس کو مزید زیادہ دیر نہیں تھام سکوں گا۔ جدوجہد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے کلمہ پڑھا اور پھر سورۂ ملک کی تلاوت شروع کر دی۔

اور اچانک ہی زوردار بارش بھی شروع ہو گئی جیسے پہلے کے مصائب ناکافی تھے۔

اسی لمحے اوپر سے ایک مہربان آواز سنائی دی۔ "ظفر صاحب' میں نے درخت کے تنے سے ڈوری باندھ دی ہے اور اسے نیچے لٹکا رہی ہوں۔ اسے پکڑ لیں اور حوصلہ رکھیں۔"

صائمہ کی آواز مجھے فریب سماعت محسوس ہوئی تھی مگر پھر مجھے بیلٹ کا ایک سرا اپنے سامنے گرتا نظر آیا۔ اب وہ میرے سامنے پھانسی کے پھندے کی طرح لہرا رہا تھا۔ صائمہ نے نچلی بیلٹ کا چھوٹا سا پھندا بنا دیا تھا تاکہ مجھے اسے تھامنے میں زیادہ آسانی ہو بلکہ میں اس میں سے ہاتھ بھی گزار سکتا تھا۔ اس طرح پکڑنے میں اور آسانی ہو جاتی۔

لیکن کام آسان نہیں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ دکھ رہے تھے۔ گھاس مجھے اپنے ہاتھوں سے پھسلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں ایک ہاتھ سے گھاس تھام کر دوسرے ہاتھ سے وہ پھندا تھامنا خطرناک تھا۔ اگر گھاس میری گرفت سے نکل گئی تو..........؟ یہ خیال ہی روح فرسا تھا مگر پھر یہ بھی خیال آیا کہ کوشش کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہاتھ شل ہو کر گھاس کو چھوڑ بیٹھیں گے۔ بہتر یہی تھا کہ جلد از جلد کوشش کر لی جائے۔ ہاتھوں کی طاقت بہت تیزی سے جواب دے رہی تھی۔

چنانچہ میں نے حتی الامکان آہستگی سے داہنے ہاتھ کی گرفت گھاس پر مضبوط کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کو فارغ کیا۔ وہ میرے لیے قیامت کا لمحہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس لمحے سانس بھی روک لی تھی۔ اس لمحے میں ایک ہاتھ کے زور پر لٹکا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ میں نے پھندے میں سے گزارنے کی کوشش کی لیکن جسم غیر متوازن ہونے کی وجہ سے ناکام رہا۔ ساتھ ہی داہنے ہاتھ سے گھاس چھوٹتی محسوس ہوئی۔ تاہم دوسری کوشش کامیاب ثابت ہوئی۔ میں نے پھندے میں سے ہاتھ گزار کر بیلٹ کو تھام لیا لیکن گھاس ابھی نہیں چھوڑی۔

میں نے سکون کی سانس لی مگر اسی لمحے ایک اور خیال نے مجھے لرزا دیا۔ یہ ڈوری

اور بیلنس کا وہی کامبی نیشن تھا' جس کی مدد سے ہم نے جھیل کے عقب میں برفانی نالہ پار کیا تھا مگر یہ صورت حال اس سے مختلف اور مخدوش تھی۔ وہاں ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے تھے جبکہ یہاں میں معلق تھا۔ یعنی ڈوری پر بوجھ کئی گنا زیادہ تھا۔ اس بوجھ کے نتیجے میں' جڑی ہوئی کوئی بیلٹ کھل بھی سکتی تھی اور ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ اس خیال کے بعد مجھے گھاس کو چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"بیلٹ تھام لی ہے تو اب پاؤں جماتے ہوئے چڑھنے کی کوشش کیجئے۔" اوپر سے صائمہ کی آواز سنائی دی۔ آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

میں کوئی کوہ پیما نہیں تھا۔ اس طرح کا کوئی منظر اسکرین پر دیکھ کر بھی میری حالت بگڑنے لگتی تھی۔ اب میں خود اس طرح کی صورت حال سے دو چار تھا۔ "بہت مشکل ہے..........." میں منمنایا۔ بولنے میں بھی توانائی ضائع ہونے کا ڈر تھا' جو ویسے ہی کم رہ گئی تھی۔

"ہمت کریں۔ فاصلہ زیادہ نہیں۔ بمشکل آٹھ دس فٹ ہے۔" صائمہ نے کہا۔

میں نے داہنا ہاتھ گھاس سے ہٹایا اور بیلٹ تھام کر پہاڑ کی دیوار پر پاؤں جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی سانس اکھڑنے لگی۔ میں رک گیا۔ "نعیم اور طاہر........." میں نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔ بات پوری بھی نہیں کی گئی۔
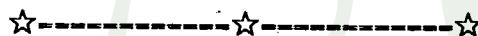
صائمہ نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ "وہ ذرا دور تھے۔ پہنچنے والے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے طاہر کی آواز سنائی دی۔ "ظفر بھائی' ہم آ گئے ہیں۔ آپ چڑھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ ادھر ہم بھی آپ کو اوپر کھینچنے کی کوشش کریں گے۔"

میں اسے منع کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ اس کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا مگر مجھ میں اب بولنے کی سکت نہیں تھی۔ میں آخری کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ادھر وہ لوگ بھی مجھے کھینچ رہے تھے۔ فاصلہ آہستہ آہستہ طے ہوتا رہا لیکن ہر لمحہ مجھے یہ خوف تھا کہ مددگار رسی ٹوٹ جائے گی اور میں...........

اب بیلٹ ختم ہو چکی تھی اور میرے ہاتھوں میں موٹی ڈور تھی۔ مجھے احساس بھی

نہیں تھا کہ میرے ہاتھ چھلے جا رہے ہیں۔ پورا جسم ہی پھوڑا بنا ہوا تھا۔

"ایک ہاتھ بڑھائیں۔" صائمہ کی آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مجھ سے کوئی تین چار فٹ اوپر تھی اور اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ میں نے پاؤں جما کر خود کو مزید اوپر چڑھایا۔ زیادہ فاصلے سے اس کا ہاتھ تھامنا اس کے لیے مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔

خاصا اوپر پہنچ کر میں نے صائمہ کا ہاتھ تھاما اور زور لگایا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اوپر پہنچ گیا ہوں اور خیریت سے ہوں۔ میں مسطح زمین پر چت لیٹا ہانپتا رہا پھر میں نے طاہر اور نعیم کی تلاش میں سر گھمایا۔ مجھے حیرت تھی کہ صائمہ کی جگہ ان میں سے کسی نے ہاتھ کیوں نہیں بڑھایا۔ اس کی وجہ فوراً ہی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سب سے زیادہ اہم کام میں مصروف تھے۔ جس درخت سے صائمہ نے ڈوری باندھی تھی' وہ آگے پیچھے اس درخت کے تنے کے دونوں طرف پاؤں جمائے ڈوری کے ذریعے مجھے اوپر کھینچ رہے تھے۔ اچھی خاصی ڈوری ان کے پاس تھی۔ اسے کھینچے رکھنا بہت اہم تھا۔ خدانخواستہ وہ چھوٹ جاتی تو میرا سنبھلنا ناممکن تھا۔

انہوں نے سکون کی سانس لے کر ڈوری کو چھوڑ دیا پھر وہ میری طرف آئے اور مجھے اٹھا کر درخت کے نیچے لے گئے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ بارش رک چکی ہے۔ کب رکی' یہ میں نہیں جانتا تھا۔

صائمہ میرے پاس بیٹھی اور اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے سہلائے تو میری چیخیں نکل گئیں۔ اس نے غور سے میری ہتھیلیوں کو دیکھا۔ "ارے.......... ان کے ہاتھ تو لہولہان ہو رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

مجھے سنبھلنے میں کافی دیر لگی۔ جسم کا یہ حال تھا کہ لگتا تھا' ہر جوڑ ہل چکا ہے۔ اس وقت میں اپنے رب کے لیے سراپا شکر تھا۔

ذرا حالت بہتر ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھا۔ "اب کیا حال ہے؟" نعیم نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے ورنہ اس وقت تو مجھے کنہار میں ہونا چاہیے تھا۔" میرے ہاتھ اب بھی لرز رہے تھے۔

وہ تینوں جھرجھری لے کر رہ گئے۔ "واقعی.......... اللہ نے کرم فرمایا۔" صائمہ نے کہا۔

"آٹھ دس فٹ کا فاصلہ اور ایسی قیامت۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"آٹھ دس فٹ!" طاہر نے حیرت سے دہرایا۔ "ظفر بھائی' فاصلہ بیس فٹ سے کم ہرگز نہیں تھا۔"

میں نے صائمہ کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ "میں یہ بتا دیتی تو آپ کے لیے حوصلہ مجتمع کرنا مشکل ہو جاتا۔"

بات درست تھی۔ میں اسے شکر گزاری سے دیکھتا رہا۔ وہ نظریں چرانے لگی۔

"اب کچھ بہتر ہوں تو چلیں۔" تھوڑی دیر بعد طاہر نے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج کر پانچ منٹ' رات پر پھیلائے اترنے کے لیے چلی آرہی تھی۔ "ہاں.......... چلو۔"

اس وقت مجھے صورت حال کا ٹھیک طور سے اندازہ ہوا۔ ہم لوگ پگڈنڈی سے کافی دور تھے۔ میں جب گرا تھا تو پگڈنڈی سے دور ہو گیا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کو یہاں تک پہنچنے میں دیر لگی تھی۔ خاص طور پر نعیم اور طاہر کو۔ اور وہ کافی دشواری سے پہنچے ہوں گے۔ کیونکہ اب بھی ہمیں پگڈنڈی تک پہنچنے میں کافی دشواری ہوئی۔ بہرحال ہم خیریت سے اتر گئے۔

گلیشیر پار کرنے کے بعد ناران تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ راستے میں کئی بار میں نے چاہا کہ صائمہ کا شکریہ ادا کروں لیکن بعض موقعوں پر لفظ نہ ساتھ دیتے ہیں' نہ حق ادا کرتے ہیں۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہیں مگر میری اس نئی زندگی کا وسیلہ صائمہ ہی بنی تھی۔ اس نے حاضر دماغی اور حوصلہ مندی سے کام لیا تھا۔ ڈوری اور اس

سے بندھی ہوئی بیلٹس خوش قسمتی سے اس کے ہینڈ بیگ میں تھیں اور اس نے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا تھا۔ یہی نہیں' اس نے مجھے بے پایاں حوصلہ دیا تھا۔ مجھ میں جینے کی امنگ جگائی تھی ورنہ میں اوپر پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہم تمام راستے فکر مند رہے کیونکہ اگلی صبح ناران سے روانہ ہونا تھا اور ہم لوگ بہت تباہ حال ہو رہے تھی۔

اسکول میں سب ہمارے لیے پریشان تھے۔ نعیم نے سر ممنون کو پوری روداد سنائی۔ سر ممنون نے روانگی ایک روز کے لیے مؤخر کر دی۔ خوش قسمتی سے اگلے روز جمعہ تھا۔ ہم دیر تک سو سکتے تھے اور ہم ڈٹ کر سوئے۔ نعیم نے سوتے میں ہی میرے ہاتھوں پر دوا لگائی تھی۔

☆------------☆------------☆

جمعے کی شام کنہار کے کنارے چائے کا پروگرام تھا۔ مشتاق اعوان صاحب بھی شریک تھے۔ میں اچھی نیند کی بدولت تازہ دم ہو چکا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کئی گروپ بنے ہوئے تھے۔ میں ٹیچرز کے گروپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ غزل کی فرمائش سرممنون نے کی۔ اعوان صاحب نے تائید کی پھر اس معاملے میں سب ایک آواز ہو گئے۔ ادھر ادھر سے بھی شعروشاعری کا ذوق رکھنے والے آگئے۔ اچھی خاصی محفل بن گئی۔ سرممنون بھی شعر کہتے ہیں۔ انہوں نے خود بھی غزل سنائی۔

"اب شروع کردیں ظفر بھائی۔" طاہر نے کہا۔

میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر سماں اتنا خوبصورت تھا۔ شام کا جھٹ پٹا اتر رہا تھا' میں نے غزل شروع کی..........

عاشق ماہ تاب تھا ساحل۔ جب گھٹا چھائی بجھ گیا ساحل
تند موجوں سے سیپیاں لے کر۔ رات بھر کھیلتا رہا ساحل
پانیوں میں سراب ریگ ملا۔ آنکھ جھپکی تو دور تھا ساحل
اپنے سینے پہ زخم کی صورت۔ جمع کرتا ہے نقش پا ساحل
اک قیامت ہے وصل دونوں کا۔ ایک طوفان' دوسرا ساحل
ڈھا دیے سب گھروندے موجوں نے۔ اور تکتا ہی رہ گیا ساحل

لمحہ لمحہ ابھرتا ڈوبتا چاند۔ رات بھر سوتا جاگتا ساحل
زندگی کی لکیر ہاتھوں پر۔ جیسے کوئی کٹا پھٹا ساحل

سماں بندھ گیا تھا۔ بے ساختہ داد مل رہی تھی۔ بعض شعر کئی بار سنے گئے۔ آخری شعر سن کر صائمہ نے کہا۔ "اس کے باوجود موت سے ہاتھ ملا کر لوٹ آئے آپ۔"

اس پر قہقہہ لگا۔ اعوان صاحب بولے۔ "بھائی.......... ایک نظر اور دیکھ لو زندگی کی لکیر کو۔"

"ویسے صائمہ' یہ تم نے موت سے ہاتھ ملانے کی خوب کہی۔" سرممنون نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یقین نہ آئے تو ان کے کھلے ہوئے ہاتھ دیکھ لیں۔" صائمہ نے بے ساختہ کہا۔

اس پر ایک اور قہقہہ لگا۔

مغرب ہونے والی تھی۔ لہٰذا محفل برخاست ہو گئی۔ اسکول پہنچے تو اعوان صاحب بہ اصرار ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہ ہماری الوداعی رات تھی ناران میں۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں

اگلے روز واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اس سفر میں ہمارا واحد پڑاؤ بالاکوٹ تھا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ہم بالاکوٹ پہنچے اور گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ میں قیام کیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بہت ملنسار' خوش اخلاق اور دردمند انسان تھے۔ سرممنون جس اسکول میں بھی قیام کریں' وہاں کچھ دوائیں' کچھ اسکاؤٹ بیجز اور ایسی ہی دوسری چیزیں ضرور دیتے ہیں۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو وہ پیکٹ پیش کیے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو کچھ کہا' وہ ایک امانت تھی' جو میں دیر سے سہی' اب اپنے وطن کے متمول لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا۔ "آپ لوگ کراچی سے آئے ہیں۔ کراچی بہت بڑا اور بہت محبت کرنے والا شہر ہے۔ اس شہر پر اللہ کا خاص کرم ہے۔ وہاں بے شمار ایسے لوگ ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے اتنا نوازا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی میرے اسکول کے بچوں

کے تمام مسائل حل کر سکتا ہے۔" انہوں نے توقف کیا اور ایک گہری سانس لے کر کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے "آپ لوگ تو آتے رہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہاں کتنی غربت ہے اور تعلیم کتنا بڑا جہاد۔ آپ اپنے شہر کے صاحب حیثیت لوگوں کو یہاں کا حال سنائیں۔ ہم تعلیم کی ہر ممکن ترغیب دیتے ہیں لیکن عالم یہ ہے کہ طلبا میں حصول علم کا جذبہ تو ہے لیکن وہ کتابوں سے.......... بلکہ یونیفارم تک سے محروم ہیں۔ کتابوں کے سلسلے میں تو کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا ہے مگر یونیفارم پر زور دیں تو.......... تو والدین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ بچے کو گھر بٹھالیں۔ ہمارے کراچی کے بھائیوں سے کہیں کہ اگر وہ کسی ایک طالبعلم کے لیے بھی یونیفارم فراہم کر سکیں تو یہ ثواب جاریہ ہو گا۔ بھائیوں کا اتنا حق تو ہوتا بھی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اگلے سال انشاء اللہ میں اس سلسلے میں خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔" سر ممنون نے بے حد خلوص سے کہا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سر ممنون نے ایک حیران کن لیکن بہت خوش گوار اعلان کیا۔ "لڑکیوں نے رضاکارانہ طور پر فیصلہ کیا کہ رات کا کھانا آج وہ پکائیں گی اور وہ ایسا کھانا ہو گا' جس کا تصور صرف گھر میں کیا جا سکتا ہے۔"

اس پر سب نے دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ ایک لڑکے نے پوچھا۔ "کیا پکے گا سر؟"

"یہ تو سرپرائز ہو گا آپ سب کے لیے۔ سامنے آئے گا تو دیکھ لیجیے گا۔"

کھانے کی تیاریاں زوروشور سے شروع کر دی گئیں۔ لڑکیاں بھی بے حد پُرجوش تھیں۔ صائمہ ان میں پیش پیش تھی۔ کام بہت رازداری سے کیا جا رہا تھا۔ عقبی حصے کو کچن کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس طرف مردوں اور لڑکوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھ بجے کے قریب میں مردانہ کمرے سے نکلا اور راہداری سے گزرنے لگا۔ ارادہ باہر جانے کا تھا۔ راہداری کے ساتھ ایک باڑھ تھی' جس کے دوسری طرف اسکول کا باغیچہ تھا۔ باڑھ میں چاروں طرف جگہیں چھوڑ کر گیٹ سے بنائے گئے تھے۔

اچانک مجھے باڑھ کے اس طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "چلو.......... اب مان جاؤ۔ میں تمہیں راولپنڈی سے ایک جوڑا دلا ہی دوں۔"

میں باڑھ کے درمیانی خلا کی طرف بڑھنے لگا۔ "آپ اتنی بار یہ بات کہہ چکے ہیں اور میں نے ہر بار یہی کہا ہے کہ آپ اپنے لیے ڈھنگ کے کپڑوں کا بندوبست کریں۔ ٹیچر کو پیوند لگا قومی لباس تو زیب دیتا ہے لیکن لنڈے کی پتلون اسے پھٹیچر بنا دیتی ہے۔" یہ صائمہ کی آواز تھی جو میں نے صاف پہچان لی۔

"تم کچھ بھی کہو' میں تمہیں ان دو جوڑوں میں دیکھ دیکھ کر عاجز آ چکا ہوں۔"

"یہ میں لائی ہی اسی لیے تھی۔ پیسے وصول ہو گئے ان کپڑوں کے۔" صائمہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اچھا.......... اب مجھے راستہ دیں۔"

"پہلے کپڑوں کے سلسلے میں جواب دو مجھے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ آپ ٹیچر ہیں۔ اسی لیے میں پورے سفر میں آپ کو برداشت کرتی رہی ہوں.........."

"ورنہ کیا کر لیتیں؟" مردانہ آواز کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

"میں ہر زاویے سے کچھ نہ کچھ کر سکتی ہوں۔ آپ مجھے جانتے نہیں۔ میں آپ کی رپورٹ ڈائریکٹوریٹ میں بھی کر سکتی ہوں اور وزارت تعلیم میں بھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بعد اس معزز پیشے کو آپ سے نجات مل جائے گی۔ میں یہاں سر ممنون سے شکایت کر دیتی تو سر ممنون آپ کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کرتے پھر میں اگر ابھی آپ پر اپنی زبان کی دھار استعمال کرنا شروع کروں تو دس منٹ بعد پارٹی کے لڑکے آپ پر ہاتھ صاف کر رہے ہوں گے اور آخری بات یہ کہ اگر میں خود آپ کو ٹیچر کی بجائے بلیک بورڈ سمجھ کر آپ کے وجود پر مارپیٹ کا جواب مضمون لکھنا شروع کر دوں تو ہفتوں ڈسٹر سے رگڑے لگواتے رہیے گا' تب کہیں وہ تحریر کسی حد تک مٹے۔ میرے پاس بیلٹ تو کوئی نہیں' لیکن میں نے کراٹے کی تربیت لی ہے۔" صائمہ نے گہری سانس لی۔

"مجھے تو اب بھی افسوس ہے کہ پورے سفر میں آپ کو برداشت کرنے کے بعد آخری

مرحلے میں آپ سے بدتمیزی سے بات کر رہی ہوں۔"

میں باڑھ کی اوٹ میں کھڑا دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ ٹیچر شفقت صاحب تھے۔ ان کا انداز مجھے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بہت چھچھورے لگتے تھے۔ اب اس وقت ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور وہ مجرموں کے انداز میں کھڑے تھے۔ صائمہ کے چہرے پر تاسف تھا۔

پھر اچانک صائمہ نے کہا۔ "سر.......... میں آپ کا مسئلہ سمجھتی ہوں۔ پلیز آپ کراچی میں مجھ سے ملئے گا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ اب آپ جائیں.......... پلیز۔"

باڑھ کے درمیانی خلا سے شفقت صاحب باہر آرہے تھے اور میں اندر جا رہا تھا۔ صائمہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ "صائمہ.......... یہ نہ سمجھنا کہ میں جاسوسی کر رہا تھا۔ بس گزرتے ہوئے کان میں آواز پڑی اور پھر میں سنے بغیر نہیں رہ سکا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

"یقین کریں' انہوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا ورنہ میں ٹیچرز کا بڑا احترام کرتی ہوں۔" وہ صفائی پیش کرنے لگی۔

"میں سب سمجھ گیا ہوں۔ وہ اس سے زیادہ خراب سلوک کے مستحق تھے لیکن میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں تم سے.......... ذاتی نوعیت کی' بتاؤ گی؟"

"بتانا مناسب ہوا تو ضرور بتاؤں گی۔ پوچھیے؟"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم صرف دو جوڑے لے کر سفر پر کیوں آئیں؟ تم نے ہر اعتبار سے خود کو چھپا کر کیوں رکھا۔ جو تھیں' خود کو اس سے مختلف کیوں ظاہر کیا؟ اور شفقت صاحب کا مسئلہ کیا ہے؟ اور تم اسے حل کیسے کرو گی؟"

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ "یہاں تو ممکن نہیں۔ ان سوالوں کا جواب میں آپ کو کراچی میں دے سکتی ہوں۔ وہیں دوں گی۔"

"کراچی میں۔" میں تلخی سے ہنسا۔ "جواب نہیں دینا تھا تو صاف انکار کر دیتیں۔

خواہ مخواہ ٹالا تم نے۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا پک رہا ہے آج؟"

"وہ تو سرپرائز ہے آپ کے لیے۔ پوچھ کر اپنا لطف خراب نہ کریں۔" اس نے کہا۔ "اچھا.......... میں چلتی ہوں۔"

وہ دن ہی شاید جاسوسی کا تھا۔ وہ گئی تو نعیم اور طاہر آگئے "کیا باتیں ہو رہی تھیں؟" طاہر نے پوچھا۔

مجھے شفقت صاحب پر بری طرح غصہ آرہا تھا۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ نعیم بولا۔ "وہ ہیں ہی گھٹیا آدمی۔ ٹوور پر صرف خوشامد کے زور پر آئے ہیں۔ ایک پیسہ بھی نہیں دیا انہوں نے۔"

"اور آخری بات کیا تھی؟" طاہر نے شوخی سے پوچھا۔

"اگر تم نے سن لی ہے تو اس کا جواب بھی سن لیا ہوگا۔" میں نے بدمزاجی سے کہا۔

"وعدہ کریں' کراچی میں آپ کے سوالوں کا جو جواب ملے گا وہ مجھے بھی بتائیں گے۔"

"کراچی پہنچتے پہنچتے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ صائمہ تو دور کی بات ہے' شاید کراچی میں تم سے بھی رابطہ نہ ہو۔"

"مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔" طاہر نے دل گرفتگی سے کہا۔ "خیر.......... مجھے آپ کی بات غلط ثابت کر کے خوشی ہوگی۔"

"خوشی تو مجھے بھی ہوگی۔" میں مسکرا دیا۔

رات کے کھانے پر خوش گوار حیرت ہوئی.......... بہت خوش گوار۔ لڑکیوں نے یمہ بھرے پراٹھے پکائے تھے۔ چٹنی پیسنے کے لیے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر گئی تھیں۔ س روز سب بہت خوش تھے۔

☆===========☆===========☆

اتنے حسین مقامات دیکھنے کے بعد واپسی کا سفر بہت بے زار کن ہوتا ہے۔ میں تو ہمیشہ سوچتا ہوں کہ کوئی ایسا جادو ہو کہ ناران میں آنکھیں بند کروں اور آنکھیں کھولوں تو کراچی میں ہوں لیکن یہ ممکن نہیں۔ تاہم اس بار میں نے راولپنڈی سے ریل کے سفر کی بجائے فلائٹ میں سیٹ ریزور کرالی تھی۔ یوں میں کوفت سے بچ گیا تھا۔ اگرچہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ اپنے ہم سفروں کو کوفت کے سفر میں یوں چھوڑ بھاگنا صریحاً زیادتی ہے۔

میں نے راولپنڈی اسٹیشن پر پارٹی کو خدا حافظ کہا۔ میری فلائٹ رات کی تھی۔

☆-----------☆-----------☆

اور یہ پانچ سال بعد کی بات ہے!

میں مری میں سرحد ویو ہوٹل کے سبزہ زار میں بیٹھا گزرے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پانچ سال پہلے کے ٹوور کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں ٹوور پر آیا تھا۔ مہلت اور فرصت ہی اب ملی تھی۔ ایک سال بعد میری شادی ہو گئی تھی۔ سیٹل ہونے میں وقت لگا پھر بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ چھوٹے بچے کو ساتھ لے کر سفر کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب بیٹا سوا تین سال کا تھا۔ میں اسے باہر کی دنیا.......... اپنا حسین اور پاک وطن دکھانے لایا تھا۔ ارادہ تھا کہ اس تجربے سے گزارنے کے بعد اسے اسکول میں داخل کرا دوں گا۔

میری بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ کراچی پہنچنے کے بعد طاہر سے کسی طور پر رابطہ نہیں ہوا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہر آدمی اپنی زندگی گزارتا ہے۔ اس کا ایک حلقہ احباب ہوتا ہے۔ کراچی کی تیز رفتار مشینی زندگی میں ملنے ملانے کے معاملے میں اپنے حلقہ احباب سے بھی انصاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں تین ہفتے کے ناپائیدار تعلق کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

مگر اس لمحے مجھے طاہر بہت شدت سے یاد آیا۔

بعض لمحے بڑے سچے ہوتے ہیں۔ اسی لمحے طاہر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے اسے پہچانا نہیں۔ وہ بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ پانچ سال پہلے لڑکا لگتا تھا اور اب جوان مرد تھا بلکہ وہ اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔ کنپٹیوں پر بالوں میں سفیدی ابھر آئی تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

"ظفر بھائی.......... السلام علیکم۔"

میں نے اس کی آواز سے اسے پہچانا اور جھپٹ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ "یہ

قبولیت کا لمحہ تھا طاہر۔ یقین نہیں کرو گے' اسی لمحے میں نے تمہیں شدت سے یاد کیا تھا...''

''یقین کیوں نہیں کروں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے۔ دوسرے میں شیطان ہوں۔ آپ نے یاد کیا ہے تو آیا ہوں۔''

''پارٹی کے ساتھ تو نہیں آئے ہو تم؟''

''نہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ مری پہنچ کر ملوں گا۔ ابھی مری پہنچا ہوں۔''

ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ ''یار طاہر' تم نے مجھے شکست کی خوشی بھی نہیں دی۔'' میں نے شکایت کی۔

''کیا مطلب؟''

''یاد بھی نہیں۔ تم نے کہا تھا کہ میری بات غلط ثابت کر کے تمہیں خوشی ہوگی۔ میں نے کہا تھا...... خوشی تو مجھے بھی ہوگی۔''

''یاد ہے ظفر بھائی۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''لیکن کراچی پہنچ کر میں نے بہت خراب وقت گزارا۔ پھر ایک ماہ کے بعد میں اسٹیٹس چلا گیا۔ یقین کریں' آپ مجھے ہمیشہ یاد رہے لیکن میری حالت ایسی نہیں تھی کہ آپ سے رابطہ کرتا۔''

''کوئی راحیلہ کا چکر تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوڑیں اس ذکر کو' اپنی سنائیں۔''

''میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔''

کچھ دیر ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ''صائمہ سے آپ کا رابطہ ہوا تھا؟''

''ہاں...... ہوا تھا۔''

''اس نے آپ کے ان سوالوں کے جواب دیے تھے؟''

''ہاں!''

''تو مجھے بتائیں۔ یاد ہے...... آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ایسا ہوا تو ضرور بتائیں

گے۔''

''مجھے یاد ہے...... اور میں بتاؤں گا بھی لیکن تم پہلے مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔ راحیلہ کے ذکر پر تم بجھ گئے ہو۔''

اس کے چہرے سے دلی کرب ظاہر ہونے لگا۔

''سنو طاہر...... اگر کوئی دکھ کی بات ہے تو ضرور کہہ دو۔ بوجھ ہلکا ہو جائے گا تو شفا آسان ہو جائے گی۔''

وہ چند لمحے ہچکچایا پھر اس نے مجھے اپنی کہانی سنانا شروع کی......

وہ کراچی پہنچا تو بہت ایکسائٹڈ تھا۔ اس نے راحیلہ کے سلسلے میں فوراً ہی اپنی امی سے بات کی۔ امی نے اس سے تفصیل سنی اور اسے سمجھایا کہ وہ بہت جلد بازی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ طاہر نہ مانا تو وہ بولیں۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عرصے میں کسی کو کیسے پرکھا جا سکتا ہے۔''

''پرکھنے کے لیے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔'' طاہر نے کہا۔

امی مسکرائیں۔ ''اتنا اعتماد ہے تو مجھے بھی ایک آزمائش کی اجازت دو۔ وہ اس میں پوری اتری تو میرا وعدہ ہے کہ ایک مہینے کے اندر دھوم دھام سے شادی کروں گی تمہاری۔''

طاہر نے اجازت دے دی۔

اگلے روز راحیلہ نے طاہر کے گھر فون کیا۔ فون طاہر کی امی نے ریسیو کیا۔ راحیلہ سے نام پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''طاہر جب سے آیا ہے' تمہارے ہی متعلق باتیں کرتا رہتا ہے ہر وقت' مجھے تو تم سے ملنے کا اشتیاق ہو گیا ہے۔ مکان کا مسئلہ حل ہو جائے تو تمہیں بلاؤں گی...... بلکہ تمہارے گھر بھی آؤں گی۔''

راحیلہ یہ سن کر کنفیوز ہوئی ہوگی۔ ''مکان کا کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے بیٹی...... آج کل بھائی مل کر کہاں رہتے ہیں۔'' طاہر کی امی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ مکان طاہر کے تایا کا ہے۔ اب تو ہم آئے دن کے لڑائی جھگڑوں

سے تنگ آچکے ہیں۔ سوچا ہے' دو کمروں کا کوئی چھوٹا سا مکان کرائے پر مل جائے تو آئے دن کی جھک جھک سے جان چھوٹے مگر مرے سے مرے مکان کا ڈپازٹ بھی پانچ ہزار ہے آج کل اور اس مہنگائی کے زمانے میں پانچ ہزار تو ایک سال میں بھی نہیں بچایا جا سکتا۔ ادھر تمہارے انکل کی کنسٹرکشن کمپنی میں بھی چھانٹی ہو رہی ہے۔ وہ بے چارے تو فکر روزگار میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر راحیلہ نے پوچھا۔

"طاہر کہاں ہیں؟"

"وہ تو دفتر گیا ہوا ہے۔ اس کی نوکری بھی خطرے میں ہے۔ تین ہفتے کی یہ چھٹیاں مصیبت بن گئیں۔ وہ سفر میں تھا اور دفتر سے بلاوے پر بلاوا آ رہا تھا۔ بس خدا خیر کرے۔ آج ہی دفتر گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی..."

"تم پھر فون کر لینا بیٹی.......... ابھی ہمیں دو تین ماہ لگیں گے شفٹ ہونے میں۔ جب تک تو فون اپنا ہی ہے۔"

راحیلہ نے خدا حافظ کہے بغیر ریسیور پٹخ دیا تھا۔

طاہر تین چار دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ فون نہ آیا تو پانچویں دن وہ اس کے کالج چلا گیا۔ راحیلہ کالج سے نکلی تو اس نے راحیلہ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن راحیلہ اسے دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ "کیا بات ہے' تم یہاں کیوں چلے آئے ہو؟"

"تم سے بات کرنی ہے۔"

"میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"لیکن راحیلہ.........."

"دیکھو طاہر' شرافت سے نہیں جاؤ گے تو مجھے تمہاری مرمت کرانے میں دو منٹ بھی نہیں لگیں گے۔"

طاہر کا چہرہ فق ہو گیا۔ "راحیلہ......... میں تمہیں اپنی امی سے ملوانے لے چلوں گا۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ اچھا......... گاڑی میں بیٹھ کر سکون سے بات کر لو۔ پتا تو چلے' ہوا کیا ہے۔"

"گاڑی تمہارے تایا کی ہے یا دفتر کی؟" راحیلہ کے لہجے میں نفرت تھی۔

"کسی کی بھی ہو' تم اس میں بیٹھ سکتی ہو۔"

"مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ اب تم مجھے فریب نہیں دے سکتے۔"

"میں نے تمہیں کوئی فریب نہیں دیا۔ البتہ یہ ثابت ہو گیا کہ تم مجھے فریب دیتی رہی ہو۔"

"طاہر......... میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں' اپنی جھوٹی امارت سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ اب میں..."

اب طاہر کا ضبط جواب دے گیا۔ "دھمکی دینے کی ضرورت نہیں' اب میں رکوں گا بھی نہیں۔ تم میری امی کی ڈالی ہوئی آزمائش میں ناکام ہو گئیں اور میں ایک فریب سے بچ گیا۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "تمہارے لیے کشش مجھ میں نہیں' میرے اسٹیٹس میں تھی۔ میری محبت میں تمہیں اپنا مستقبل محفوظ نظر آ رہا تھا۔ ایسا تھا بھی لیکن تم نے اپنی سفاک طبیعت کی وجہ سے سب کچھ گنوا دیا۔ اب مجھے فون کرنے یا مجھ سے ملنے کی زحمت کبھی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر' راحیلہ کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی دوڑا دی۔

وہ صدمہ طاہر کے لیے بڑا تھا۔ وہ امی سے بھی خفا تھا اس کے باوجود کہ جانتا تھا' امی نے جو کچھ کیا' اچھا ہی کیا مگر کبھی کبھی آدمی کو طلسم فریب سے آزادی بھی بہت بری لگتی ہے اور آزادی دلانے والا بھی۔ طاہر امی سے اتنا خفا تھا کہ اب پاکستان میں رکنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سو وہ امریکا چلا گیا۔

"ابھی ایک ماہ پہلے واپس آیا ہوں۔" طاہر نے کہا۔ "میں نے آتے ہی امی سے معافی بھی مانگی اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔"

"سوری طاہر' مجھے بہت افسوس ہوا۔"

"حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ ایسا ہی کچھ ہو گا۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب تم دکھوں کے سفر کو دہرانے چلے آئے ہو۔"

"نہیں ظفر بھائی۔ اس ارادے سے نکلا ہوں کہ اب دھنک سے سجی آنکھوں سے صرف اپنے وطن کو دیکھوں گا۔" اس نے کہا۔ "ہاں.......... اب آپ بتائیں۔"

"ضرور.......... کیوں نہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "صائمہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے یاد دلایا۔ اس نے میرے سوالوں کا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی توجہ سے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے اس نے پہلے سے منصوبہ بندی کی تھی۔ صرف دو جوڑے کپڑے اور وہ بھی معمولی سے' جاگرز اور ہوائی چپل۔ وہ خود کو بے کشش لڑکی کے طور پر پیش کرنا چاہتی تھی۔ اس تاثر میں جو کمی ہوتی' اسے اس کا چڑچڑے پن' بدمزاجی اور بدتمیزی سے پورا کرنے کا ارادہ تھا تاکہ کوئی قریب نہ آئے۔ کوئی رومانس کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے اپنی پھول شخصیت کے گرد دانستہ کانٹوں کا حصار باندھا تھا۔ یہ حکمت عملی تھی اس کی۔"

"گریٹ.......... رئیلی گریٹ۔ ظفر بھائی' میں نے تو ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ غیر معمولی لڑکی ہے۔ اچھا.......... دوسرے سوال کا کیا جواب ملا؟"

"اس کے خیال میں شفقت صاحب کا مسئلہ تنہائی تھا اور اس کا حل شادی۔ کم تنخواہ والے ایک ٹیچر کے لیے جو اکیلا بھی ہو' شادی آسان کام نہیں۔ صائمہ نے شفقت صاحب کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس کی امی اور ابو نے ان کی شادی کرائی۔ ایک اچھی لیکن یتیم لڑکی ان کی نظر میں تھی۔"

"کمال کی لڑکی ثابت ہوئی وہ۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"درمیان میں ٹوور پر جاتے رہے ہیں آپ؟" طاہر نے پوچھا۔

"نہیں بھائی' فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے جواب دیا۔ "اس ٹوور کے بعد میرا بھی یہ پہلا ٹوور ہو گا۔ یہ امید لے کر جا رہا ہوں کہ شاید میرے حسین وطن کے حسین لیکن نظرانداز کیے گئے لوگوں پر ارباب اقتدار کی نظر کرم پڑ گئی ہو۔ ویسے اس کا امکان کم ہی ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں کے ایم پی اے کروڑوں میں خریدے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ترقیاتی فنڈ کہاں بچتا ہے۔"

"ظفر بھائی' بالاکوٹ مجھے امریکا میں بھی یاد رہا ہے۔ جانتے ہیں' میں بالاکوٹ کے طلبا کے لیے سو یونیفارم لے کر جا رہا ہوں۔"

میں نے حیرت سے.......... اور پھر محبت سے اسے دیکھا۔ "جیو طاہر.......... کاش یہ جذبہ عام ہو جائے۔"

"یہ تو فرض بھی تھا اور قرض بھی۔ یہ تو پانچ سال کی تاخیر سے ادا کر رہا ہوں۔ یہ سب آنکھوں میں بس جانے والی دھنک کا قصور ہے۔"

اسی وقت میرا بیٹا ابو ابو پکارتا میری طرف چلا آیا۔ "ابو.......... میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

طاہر نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ "آپ نے تو مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"تمہیں ایک یقینی سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"یعنی مجھے دو مبارک بادیں دینی ہیں۔" طاہر کے چہرے پر خلوص ہی خلوص تھا۔ "شادی مبارک ہو ظفر بھائی۔.......... اور بیٹا مبارک ہو۔"

میں نے کہا۔ "تم جلد بازی کر گئے طاہر۔ اتنی مبارک بادیں ایک ساتھ ہی زیادہ اچھی لگتیں۔"

"یعنی کوئی اور بھی ہے؟" طاہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہبود آبادی کے لیے لمحہ فکریہ۔"

"ایسی با[illegible]۔

[illegible]یں۔ [illegible] بیٹے سے بات کرنے دیں۔" وہ شہریار کی

میں نے شہریار سے کہا۔ "بیٹے.......... یہ تمہارے طاہر انکل ہیں۔ کتنے پیارے ہیں' یہ خود دیکھ لینا۔" بچے نے طاہر کو سلام کیا۔ طاہر نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"شہریار ظفر۔"

"ماشاء اللہ مجھ سے دوستی کرو گے؟"

میرے بیٹے نے اثبات میں سرہلایا۔

اب طاہر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ظفر بھائی.......... شہریار کو دیکھ کر مجھے کسی کا خیال آتا ہے۔ کوئی جانی پہچانی صورت.......... لیکن نام یاد نہیں آتا.........." طاہر کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ "کس سے ملتی ہے اس کی صورت؟"

"اپنی ماں سے۔" عقب سے آواز آئی۔ میری بیوی سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ "کیسے ہو طاہر؟"

طاہر گنگ بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ چند منٹ میں وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا۔ "اب.......... اب میں کیا کہوں تمہیں.......... نہیں آپ کو.......... اب تو آپ بھابی ہیں۔"

"ہاں.......... یہ ٹھیک ہے۔" میری بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو یہ گل کھلایا آپ نے؟" طاہر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بس بھائی' ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"کیوں.......... کوئی پچھتاوا ہو رہا ہے اب؟" میری بیوی نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔

"نہیں.......... ایک شعر یاد آ رہا ہے اپنا.........."

رم جھم میں شوق کی وہ دھنک سا دکھائی دے
تحلیل ہوں یہ رنگ تو چہرہ دکھائی دے

"ماشاء اللہ۔ وہ رنگ ابھی تک چل رہے ہیں؟" طاہر بولا۔

"نہیں۔ رنگ تو بہت پہلے تحلیل ہو چکے تھے۔"

"پھر برآمد کیا ہوا؟"

"دھنک.......... صرف دھنک۔"

طاہر ہنسنے لگا۔ صائمہ کھسیا گئی۔

"تو یہ تھا تیسرا سرپرائز۔" طاہر نے کہا۔ "اب تیسری مبارک باد لیں ظفر بھائی۔ صائمہ بھابی مبارک ہوں۔"

"اب میں شکریہ کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے اتنی مبارکبادیں دی ہیں تو میں بھی تمہیں حلق تک مٹھائی سے بھر دوں گا انشاء اللہ۔"

اس بار ہم تینوں ہنسنے لگے۔ شہریار ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہمیں مصروف دیکھ کر اپنا پسندیدہ نغمہ گنگنانا شروع کر دیا۔ "ایسی زمیں اور آسماں' ان کے سوا جانا کہاں' بڑھتی رہے یہ روشنی' چلتا رہے یہ کارواں' دل دل پاکستان' جاں جاں پاکستان' دل دل.........."

ہم اپنی ہنسی بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ ہماری نظروں سے بے خبر جھوم جھوم کر گاتا رہا۔ طاہر کی نظروں میں حیرت اور خوشی تھی۔ صائمہ کی نظروں میں فخر تھا اور میں اس لمحے سراپا شکر تھا اپنے اللہ کے لیے۔

"میرے بیٹے۔ اللہ تمہیں بہت اچھا مسلمان اور بہت اچھا پاکستانی بنائے۔" میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ "میں تمہیں تمہارے دل' تمہاری جان سے ملوانے.......... متعارف کرانے ہی تو نکلا ہوں۔" میں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

====== **ختم شد** ======